اب فیس کیسے جمع ہو گی؟

محمد عثمان جامعی

"یہ لو فیس کے پیسے!" صارم کی سوتیلی ماں نے اس کے ہاتھ پر پانچ سو کا نوٹ یوں رکھا جیسے بھیک دے رہی ہو۔ صارم نے نظریں جھکا کر وہ نوٹ اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ کل فیس جمع کرانے کا آخری دن تھا۔ اس کی ٹیچر نے صاف کہہ دیا تھا: "تم ہر مہینے فیس لیٹ جمع کراتے ہو۔ اس بار اگر ایک دن کی بھی دیر ہوئی تو تمھیں اسکول سے نکال دیا جائے گا۔"

اب ننھا صارم ٹیچر کو کیا بتاتا کہ کتنی بار کہنے کے بعد اسے گھر سے فیس کے پیسے ملتے ہیں۔ وہ یوں بھی سوتیلی ماں سے کچھ کہتے ڈرتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جھڑکیاں سننے، ڈانٹ ڈپٹ سہنے اور تھپڑ کھانے کے بعد اس میں ہمت ہی کہاں تھی کہ وہ ان سے کچھ کہہ سکے۔ اسکول کی فیس دینے کی تاریخ قریب آنے لگتی تو ڈرے ڈرے لہجے میں بس اتنا کہہ پاتا: "امی! وہ اسکول کی فیس"۔۔۔۔ جواب میں اسے کھا جانے والی نظر سے دیکھا جاتا اور تلخ انداز میں کہہ دیا جاتا: "اچھا اچھا دے۔۔۔ دوں گی، زیادہ جلدی مت کر!" اور وہ چپ ہو جاتا۔

اس بار بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ آخر کئی بار کہنے کے بعد صبح اسکول جاتے ہوئے فیس کے پیسے مل گئے۔ اس نے پانچ سو کا مڑا تڑا نوٹ اپنی شرٹ کی جیب میں رکھا اور بستہ کندھے پر لٹکا کر اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے بے خیالی میں اس نے جیب کو ہاتھ لگایا: "ارے یہ کیا؟" جیب خالی پا کر وہ پریشان ہو گیا۔ اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو اگلے ہی لمحے اس پر انکشاف ہوا کہ جیب پھٹی ہوئی ہے۔

"اب کیا ہو گا؟" یہ سوچ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ تیز رفتاری سے اٹھتے قدم رک گئے، کندھے پر جھولتا بیگ نیچے آ رہا اور وہ دیوار سے ٹیک لگا کر نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑا۔

"کیا ہوا صارم؟" اس کا کلاس فیلو معاذ جو اسی محلے میں رہتا تھا، صارم کو روتا دیکھ کر اس کے قریب آ گیا۔ صارم نے اسے ساری روداد سنا ڈالی۔ معاذ کیا کرتا، صارم کا کندھا تھپ تھپا کر اسکول کی طرف روانہ ہو گیا۔

"اب مجھے اسکول سے نکال دیا جائے گا۔" صارم سوچ رہا تھا اور آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اچانک اسے اپنے سر پر پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی اور پھر یکایک ہریالا اس کے کندھے پر بیٹھا اس کے گال پر اپنا چھوٹا سا منہ دھیرے دھیرے رگڑ کر بہتے ہوئے آنسو پونچھ رہا تھا۔ صارم کو لگا جیسے کوئی مہربان دوست اسے تسلی دے رہا ہے: "گھبراؤ مت میرے پیارے دوست! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ سن کر اس کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا اور وہ اسکول کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر ہریالا، جو قریب ہی ایک منڈیر پر بیٹھا صارم کی ساری باتیں سن چکا تھا، پھر سے اڑ کر اپنی ٹیم یعنی پھرتی اور چوکنا کے پاس پہنچ گیا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ "اب ہمیں کرنا یہ ہے"

"میٹنگ" کے خاتمے کے بعد پھرتی نے اپنا منصوبہ پیش کیا، جسے سن کر ہریالا اور چوکنا اس پر عمل کے لیے تیار ہو گئے۔

۔۔۔۔۔۔

ادھر گھڑی کی سوئی بارہ کے ہندسے پر پہنچی اور اُدھر ہریالے، پھرتی اور چوکنا کے مشن کا آغاز ہوا۔ ہریالے نے اڑان بھری اور پھرتیلی اور چوکنا دبے پاؤں دوڑتے صارم کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ صارم کے دروازے پر پہنچ کر پھرتیلی چھلانگ لگا کر دیوار کے ساتھ کھڑی موٹر سائیکل پر جا بیٹھی اور اگلی ہی جست میں وہ دیوار پر اور پھر صحن میں تھی۔ ہریالا پہلے ہی صحن میں پہنچ کر گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ گھر میں تین ہی افراد تھے، صارم، اس کے ابو اور سوتیلی ماں۔ صارم اپنے کمرے میں سو رہا تھا، برابر والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ پھرتیلی نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اگلے پنجوں کا پورا زور لگا کر دروازے کو دھکا دیا جو کھلتا چلا گیا۔

کمرے میں صارم کے ابو اور اس کی سوتیلی ماں بے خبر سو رہے تھے۔ ہریالا اور پھرتیلی کمرے میں اپنی مطلوبہ چیز کی تلاش میں تھے، جو آخر انھیں نظر آ ہی گئی، صارم کی سوتیلی ماں کا ہینڈ بیگ، جو الماری کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ ہریالے نے اپنے وجود کا پورا زور لگا کر بیگ نیچے گرایا، جسے پھرتیلی نے اپنے دونوں اگلے پنجوں سے کیچ کر لیا۔ اب مرحلہ تھا بیگ کھولنے کا! پھرتیلی نے چاروں پنجوں سے بیگ کو جکڑا اور ہریالے نے اپنی چونچ میں پھنسا کر اس کی زپ کھول دی۔ بیگ لال ہرے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہریالے نے پانچ سو کا ایک نوٹ نکالا اور اسی طرح زپ بند کر دی۔

"ہمیں یہ بیگ واپس الماری پر رکھنا ہو گا، ورنہ کہیں صارم پر چوری کا الزام نہ لگ جائے۔" ہریالے نے سرگوشی کی

۔

"لیکن الماری پر چڑھنے کی کوئی جگہ ہی نہیں۔" پھرتیلی کے لہجے میں پریشانی تھی۔ اس نے کچھ سوچا پھر بولی: "تم اڑ جاؤ، اب الزام صارم پر نہیں آئے گا۔" اس کی بات سُن کر ہریالا اُڑ گیا۔ پھرتیلی نے ہینڈ بیگ کو دونوں پنجوں سے اٹھا کر زور سے پٹخا، جیسے وہ الماری سے گرا ہو اور "میاؤں میاؤں" کرتی ہوئی دوڑتی چلی گئی۔ بیگ گرنے اور پھرتیلی کی آواز سن کر صارم کی سوتیلی ماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، صارم کے ابو بھی جاگ گئے۔

"ان بلیوں نے تنگ کر رکھا ہے!" صارم کی سوتیلی ماں نے گرا ہوا بیگ اٹھا کر دوبارہ الماری پر رکھا اور لیٹ کر چند ہی لمحوں میں خراٹے بھرنے لگی۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اگلی صبح صارم اسکول کے لیے نکلا تو اس کے چہرے پر پریشانی دور سے دیکھی جا سکتی تھی۔

"آج تو مجھے لازمی طور پر اسکول سے نکال دیا جائے گا۔ پھر میرا کیا ہو گا؟ امی میرا کیا حال کریں گی؟" وہ سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اسے دور سے سارے محلے والوں کا چہیتا کتا چوکنا دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیا، پھرتیلی مزے سے اس کی کمر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چوکنے کے منہ میں کچھ دبا ہوا تھا۔ قریب آیا تو صارم نے دیکھا کے چوکنے کے منہ میں پانچ سو کا ایک کرارا نوٹ دبا ہوا تھا۔ اس نے صارم کے پاس آ کر وہ نوٹ اس کے پیروں پر رکھ دیا۔ اچانک کہیں سے ہریالا اُڑتا ہوا آیا اور صارم کے کندھے پر بیٹھ گیا۔

"اوہو، تو تم نے میرا کھویا ہوا نوٹ تلاش کر لیا!" اس نے پیار سے ان تینوں کے جسموں پر ہاتھ پھیرا اور پیسے بیگ کی جیب میں رکھ کر خوشی خوشی اسکول روانہ ہو گیا۔

ہریالا، پھرتیلی اور چوکنے نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور تینوں مل کر یہ گیت گانے لگے:

بھوں، بھوں، میاؤں میاؤں، ٹیں ٹیں ٹیں
ہم تو ساتھی سب کے ہیں
کام آتے ہیں اوروں کے
ہم تو سب کا بھلا کریں
بھوں، بھوں، میاؤں میاؤں، ٹیں ٹیں ٹیںn

عفان کا عہد

رب نواز خان۔ کراچی

عفان اسکول سے گھر لوٹا تو اس کی خوشی دیدنی تھی، کیوں کہ اس نے نہ صرف اپنی کلاس میں بلکہ پورے اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کے والدین کو جب اس کی کامیابی کا پتا چلا تو وہ بھی خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ اس کی امی تو بار بار اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔ پھر اس کے ابو بازار سے مٹھائی خرید کر لائے اور پورے محلے کے ساتھ ساتھ پورے اسکول میں تقسیم کی۔ انہوں نے اپنے گھر پر ایک شان دار پارٹی کا اہتمام بھی کیا جس میں عفان نے اپنے تمام دوستوں کو مدعو کیا۔

عفان ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اور ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور انتہائی ذہین اور لائق تھا۔ بظاہر عفان بہت اچھا لڑکا تھا، لیکن اس میں ایک خرابی یہ تھی کہ وہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ اس کے والدین اس عادت سے کافی پریشان تھے اور اکثر اسے سمجھاتے بھی تھے، لیکن عفان نے ”ایک کان سے سنو، دوسرے سے اڑادو“ والی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔

اسکول سے گھر آنے کے بعد وہ اپنا زیادہ وقت کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر گزار دیتا تھا۔ امی اسے اکثر سمجھاتی تھیں کہ بیٹا! یہ تمام نعمتیں ہمیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں۔ ہم پر اللہ کا حق ہے کہ ہم اس کا شکر ادا کریں، اس کی عبادت کریں۔ جب ہم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کو ہم سے چھین لیتے ہیں۔ نماز پڑھنا اور اللہ کی عبادت کرنا ہی ہماری زندگی کا مقصد ہے، باقی تمام دنیاوی معاملات ہماری ضرورت ہیں۔ لیکن عفان پر ان تمام باتوں کا کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا، یہاں تک کہ عفان کے سالانہ امتحان قریب آگئے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک رات اچانک عفان تیز بخار میں مبتلا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے والدین کافی پریشان ہوئے اور اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے ایک ہفتہ آرام کرنے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی کڑوی دوا بھی کھانے کو دی۔ تقریباً ایک ہفتے کے علاج کے بعد اس کی حالت بہتر ہوئی تو وہ اسکول گیا۔ کچھ دن بعد سالانہ امتحان شروع ہونے والے تھے۔ اس نے امتحان کی تیاری تو کر رکھی تھی، لیکن بیماری کی وجہ سے اس کی پڑھائی کافی متاثر ہو گئی تھی۔

پھر امتحان شروع ہوئے، جیسے تیسے کر کے اس نے وہ امتحان دے دیے اور پھر رزلٹ کا انتظار کرنے لگا۔ جس دن رزلٹ آنا تھا، اس دن اسکول میں کافی گہما گہمی تھی۔ ہر کسی کو اپنے رزلٹ کی فکر تھی۔

عفان ہر سال کی طرح اس سال بھی کافی مطمئن نظر آرہا تھا۔ آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور رزلٹ کا اعلان شروع ہوا تو عفان کے ہوش اڑ گئے۔ اس بار اس نے پہلی کے بجائے تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ پہلی پوزیشن حاشر نے اور دوسری پوزیشن یاسر نے حاصل کی تھی اور پہلی مرتبہ اس کا ریکارڈ حاشر نے توڑ دیا تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اسے اچانک امی کی بات یاد آگئی۔ ”جب ہم اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے تو وہ اپنی نعمتیں ہم سے چھین لیتے ہیں۔“

اب تو عفان بہت پچھتایا۔ اس کا دل رونے کو چاہا، لیکن صدمے سے وہ رو بھی نہیں سکا۔ اس سے ایک غلطی ہوئی تھی جس کی سزا بھی اسے مل چکی تھی۔ مگر اسی وقت اس نے اپنے اللہ سے یہ عہد کیا کہ آئندہ وہ پابندی سے نماز پڑھے گا اور اس کے تمام حقوق ادا کرے گا۔ n

احساس

شبانہ کوثر باوانی۔ کراچی

عاشر ٹی وی کے چینل مسلسل بدل رہا تھا۔ اس وقت ٹی وی کے سبھی چینل سیلاب کی تباہ کاریاں اور لوگوں کی پریشانیاں و مشکلات براہ راست دکھا رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر عاشر کو بھی بہت حد دکھ ہو رہا تھا۔ سیلاب سے متاثر ہونے والے لوگوں پر تو مصائب کا پہاڑ ٹوٹ گیا تھا۔ عاشر کو ان سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ان لوگوں کی مدد کرے، انھیں ان مشکلات سے نکالنے کے لیے کوئی نہ کوئی کام کرے۔

کالج جاتے ہوئے بھی عاشر اپنے ان مصیبت زدہ بھائیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انھی خیالات میں سوچتے سوچتے وہ بہت دور نکل آیا۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ کالج تو پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ جلدی سے مڑا اور اپنے کالج کی طرف واپس چل دیا۔ کالج میں بھی سارا دن عاشر اسی بارے میں سوچتا رہا۔ رات کو سوتے وقت بھی اسے خواب میں متاثرین سیلاب کی غم زدہ صورتیں ہی دکھائی دیتی رہیں۔

صبح بیدار ہونے پر عاشر نے اپنے دماغ اور جسم کو زور زور سے جھٹکا، ایسا لگا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔ پھر اپنی ڈائری پر کچھ تحریر کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنی امی سے اضافی جیب خرچ لیا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

عاشر کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اس کی بڑی بہن نرگس نے دیکھا کہ اس کی ڈائری سے کچھ کاغذ نیچے گر گئے ہیں۔ اس نے وہ کاغذ اٹھائے اور ان پر نظر ڈالی تو حیران رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر اپنے بھائی کے لیے مسکراہٹ تھی۔ وہ جلدی سے وہ کاغذ لے کر امی کے پاس گئی اور انھیں وہ دکھائے تو امی بھی حیران ہو گئیں۔ ان دونوں نے آپس میں آہستہ آہستہ کوئی بات کی اور مسکرانے لگیں۔

نرگس اپنے بھائی عاشر کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ کافی ذہین اور عقل مند لڑکی تھی۔ اس نے اپنی امی سے کیا بات کی تھی، یہ صرف امی کو ہی معلوم تھا۔ کچھ دیر بعد امی، ابو اور نرگس سبھی نے دیکھا کہ عاشر پریشانی کے عالم میں کچھ تلاش کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر اس کے ابو نے کہا:

"بیٹا عاشر! کہیں آپ یہ کاغذ تو نہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"جی جی ابو، میں انھی کاغذوں کو تو تلاش کر رہا تھا۔" عاشر نے جواب دیا۔

"مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! مگر کیا تم اس نیک کام میں ہمیں شریک نہیں کرو گے؟" ابو نے دوسرا سوال کیا۔ ان کے ہونٹوں پر اپنے بیٹے کے لیے بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔

عاشر نے جلدی سے کہا: "کیوں نہیں ابو! ہمیشہ اچھے اور نیک کام کا آغاز اپنے ہی گھر سے کرتے ہیں، اس لیے ہم اس نیک کام کی شروعات اپنے گھر سے کریں گے۔"

نرگس نے ان کاغذوں کو دیکھا تو اسے پتا چلا تھا کہ عاشر متاثرین سیلاب کے لیے پیسے جمع کر رہا تھا۔ وہ متاثرین کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک تقریر بھی لکھی تھی جو اسے اپنے کالج میں کرنی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کالج کے طالب علم اور دوسرے لوگ بھی متاثرین کے دکھوں کا احساس کریں اور ان کے دکھ دور کرنے کے لیے مل جل کر کام کریں۔ n

ایک پیارا جھوٹ

نام ثناء رحیم۔ چمکنی، پشاور

”میں اس سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ مجھے بھی اس جتنے نمبر چاہئیں۔ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے جو مجھ میں نہیں۔“ ہادی آج پھر غصے میں تھا۔ اس کے نمبر حذیفہ سے کم آئے تھے جس پر وہ اسے مسلسل برا بھلا کہہ رہا تھا۔ ہادی اور حذیفہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ حذیفہ کے نمبر کلاس میں ہمیشہ اچھے آتے تھے اور ہادی اس سے کم نمبر لیتا تھا۔ یہ چیز ہادی کے لیے سخت تکلیف کا باعث ہوتی تھی۔ اس بار بھی ہادی نے بہت محنت سے تیاری کی تھی، اس نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی، لیکن حذیفہ اس بار بھی اس سے زیادہ نمبر لینے میں کامیاب رہا تھا۔

سالانہ امتحان ہونے میں دو تین دن رہ گئے تھے جس کے لیے ہادی نے بہت محنت سے تیاری کی تھی، لیکن اس ساری تیاری میں اپنی کامیابی کا جذبہ کم تھا اور حذیفہ سے آگے بڑھنے کا جنون زیادہ تھا۔ ہادی ہر وقت اکیلا تیاری میں لگا رہتا تھا، دوسرے لڑکوں سے کوئی مطلب نہیں رکھتا تھا، جب کہ حذیفہ کلاس کے کم زور لڑکوں کی بھی مدد کرتا تھا اور ان کے ساتھ مل کر پڑھتا تھا۔

کل سالانہ امتحان شروع ہو رہے تھے۔ کل پہلا پرچہ تھا۔ حذیفہ اس وقت اکیلا کھڑا تھا۔ ہادی بھی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ دونوں گاڑی کا انتظار میں تھے۔ اتنے میں دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچی تو ہادی نے حذیفہ کو آگے کی طرف دھکا دیا اور وہ بے چارہ سیدھا گاڑی سے جا ٹکرایا۔ حذیفہ کے سر سے خون بہنے لگا اور وہ سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

یہ منظر دیکھ کر ہادی بوکھلا گیا اور اس نے دوڑ لگا دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے یہ کیا ہو گیا۔ اس کے حسد نے حذیفہ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ رونے لگا اور روتے روتے گھر پہنچا تو اس کی امی اسے دیکھ کر بوکھلا گئیں۔ اس نے امی کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ امی نے سن کر اسے تسلی دی اور کہا: ”بیٹا! ہمارا حسد ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ کبھی کسی سے خواہ مخواہ جلنا نہیں چاہیے، بلکہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ہماری قسمتیں اور ہمارے نصیب اللہ بناتا ہے، اس لیے ان پر دوسروں سے حسد نہیں کرنا چاہیے۔ اب تم ایسا کرو کہ جلدی سے وضو کرو اور حذیفہ کی زندگی اور صحت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔“

چناں چہ ہادی نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی اور امی کے ساتھ حذیفہ کو دیکھنے اسپتال پہنچا۔ اس وقت تک حذیفہ کو ہوش آ گیا تھا۔ اس نے اپنے والدین کو یہ بتایا تھا کہ میری اپنی غلطی کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا ہے۔ ”میں گاڑی کو دیکھ کر چکرا گیا تھا اور اس سے جا ٹکرایا۔“

یہ بات سن کر ہادی کو بہت دکھ ہوا۔ اس نے اپنے حسد کی وجہ سے اپنے دوست کی جان لینے کی کوشش کی تھی، مگر حذیفہ نے اپنے والدین سے جھوٹ بول کر ہادی کی جان بچالی تھی ورنہ ہادی کا انجام بہت برا ہو سکتا تھا۔ چناں چہ ہادی نے حذیفہ سے معافی مانگی اور حذیفہ نے بستر پر لیٹے لیٹے اسے گلے لگا لیا۔

ایک سچی کہانی

اسماء انصاری۔ ٹانگو والی

"احسن!" دادا ابو کی آواز آئی تو احسن جلدی سے ان کی طرف بھاگا۔ وہ جب بھی احسن کو بلاتے، وہ ان کی ایک ہی آواز پر کسی جن کی طرح ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ دادا ابو کا ہر کام نہایت خوشی سے کرتا۔ تہجد کے وقت اٹھ کر دادا ابو کو وضو کروانا، ان کے لیے جائے نماز بچھانا اور پھر انھیں ناشتہ خود کروانا، اسکول سے واپسی پر بھی ان کے ساتھ کھانا کھانا، نماز پڑھنا اور رات کو روزانہ ان سے کہانی سن کے سونا، یہی احسن کا معمول تھا۔

کچھ دنوں سے دادا ابو دیکھ رہے تھے کہ احسن ہر کام تو وقت پر کر رہا ہے، لیکن پڑھائی کو وقت نہیں دے رہا۔ ویسے بھی پڑھنا اس کے لیے "کے ٹو" کی چوٹی سر کرنے کے برابر تھا۔ کتابوں کو ہاتھ لگانا اس کے نزدیک گناہ تھا۔ آج بھی حسب معمول اس نے سب کام کیے، لیکن پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دی۔ رات کو جب وہ دادا ابو کے پاس پہنچا تو وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے احسن کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا: "آج میں تمھیں ایک سچی کہانی سناؤں گا۔"

"جی، جی ضرور دادا ابا!" احسن نے کہا اور پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دادا جان نے کہانی سنانی شروع کی:

"ایک بہت ہی غریب لڑکا اپنی امی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ اس کے والد بچپن میں انتقال کر گئے تھے۔ اس کی امی سلائی کر کے اس کا اور اپنا پیٹ بھرتی رہیں۔ جب اس کی عمر اسکول جانے کی ہوئی تو امی نے لوگوں کے گھروں میں بھی کام کرنا شروع کر دیا، تاکہ اپنے بیٹے کے تعلیمی اخراجات پورے کر سکے۔ وہ لڑکا ابھی چوتھی کلاس میں تھا کہ اس کی امی بیمار ہو گئیں اور کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ جب اسکول کی فیس ادا نہ ہو سکی تو اس لڑکے کو اسکول سے نکال دیا گیا۔ لڑکا بہت اداس تھا۔ لیکن پھر اس نے ایک فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گیا۔ دوسرے روز سے اس نے صبح سے شام تک چائے کے ہوٹل پر کام کرنا شروع کیا اور رات کو پڑھنے لگا۔ ہوٹل سے ملنے والے پیسوں میں سے وہ کچھ بچاتا بھی رہا اور ایک دن اس نے ایک دکان خرید لی۔ لیکن وہ اب بھی رات کو پڑھتا تھا۔ اب اس کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی تھی کہ اس نے دکان پر ایک لڑکے کو بٹھا دیا اور زیادہ توجہ پڑھائی پر دینے لگا۔ میٹرک اس نے اچھے نمبروں سے پاس کیا تو اسے وظیفہ بھی ملا اور ایف ایس سی میں داخلہ بھی مل گیا۔ اب اس کی پڑھائی کا سارا خرچ حکومت کے ذمے تھا۔ اس کے بعد وہ غریب لڑکا ایک قابل ڈاکٹر بن گیا پھر اس کی شادی بھی ایک ڈاکٹر سے ہوئی۔ اللہ نے اسے دو بیٹوں سے نوازا جن میں سے ایک برطانیہ میں ہے اور دوسرا پاکستان میں۔"

"دادا ابو! آپ اپنے اس دوست سے مجھے کب ملوائیں گے؟"

احسن بڑی دیر سے یہ کہانی سن رہا تھا، اچانک اس لڑکے سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

دادا ابو نے کہا: "میں ہوں وہ لڑکا!"

احسن حیرت سے انھیں دیکھ رہا تھا۔

"جی ہاں بیٹا۔" دادا ابو مسکرائے: "مگر کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے، محنت اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تم سمجھ رہے ہو ناں، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"جی دادا ابو! میں سمجھ گیا، اب آپ مجھے کسی کام میں کاہلی کرتے نہیں دیکھیں گے، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" n

آخر کیوں؟

وقاص اسلم کمبوہ

ندیم آج بہت خوش تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ اسے ایک بہت اچھا دوست مل گیا تھا۔وہ بار بار اپنی امی اور بھائی کو بتا رہا تھا کہ مجھے عدنان نام کا ایک نیا دوست ملا ہے جو بہت اچھے اخلاق کا مالک ہے۔ یہ سن کر امی اور بھائی بھی خوش ہوئے تھے۔

وقت گزرتا گیا جس کے ساتھ ندیم اور عدنان کی دوستی بھی مضبوط ہوتی گئی۔ دونوں ایک اسکول مگر الگ الگ کلاسوں میں پڑھتے تھے۔ عدنان آٹھویں اور ندیم ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ان کی دوستی اس قدر گہری تھی کہ اسکول کا ہر ایک بچہ ان کو رشک سے دیکھتا اور ان کی دوستی کی تعریف کرتا تھا۔دونوں دوست ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ندیم سادہ اور غریب تھا اور کسی ہوٹل پر برتن دھوتا تھا۔ لیکن عدنان دولت مند گھرانے کا تھا۔ لیکن پھر ان کی دوستی کی کشتی ہچکولے کھانے لگی۔اب عدنان پہلے کی طرح ندیم کے ساتھ نہیں رہتا تھا،اگر ملتا بھی تو بے رخی سے پیش آتا۔جب ندیم اس کی بے رخی کی وجہ پوچھتا تو وہ ٹال دیتا تھا۔

آج بھی ندیم، اپنے کام سے فارغ ہو کر عدنان سے ملنے پہنچا تو وہ بہت دیر سے آیا۔ندیم نے وجہ پوچھی تو عدنان ٹالنے لگا، لیکن ندیم کے اصرار پر وہ ایک دم پھٹ پڑا: ”تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو، ہو تو ہوٹل پر برتن دھونے والے ملازم، تمہاری اوقات ہی کیا ہے، تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟ خبردار! آج کے بعد مجھے دوست کہا یا مجھ سے بات کی تو....“

ندیم حیرت سے عدنان کو دیکھ رہا تھا جس نے اس کی ساری عزت خاک میں ملادی تھی۔ ندیم گم صم یہ سب سنتا رہا۔

اس کا قصور یہ تھا کہ وہ غریب اور یتیم تھا۔اسکول سے چھٹی کے بعد ایک ہوٹل پر برتن دھوتا تھا اور اپنی پڑھائی کا خرچ پورا کرتا تھا۔اس نے یہ بات عدنان پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ پہلے عدنان اس کے ساتھ بالکل ٹھیک تھا۔ بہت محبت اور عزت سے پیش آتا تھا۔ لیکن پچھلے دنوں اس نے ندیم کو ہوٹل پر برتن دھوتے دیکھ لیا جس کے بعد وہ اس سے دور ہونے لگا۔وہ ندیم سے دوستی توڑنے کا بہانہ تلاش کرنے لگا جو آج اسے مل گیا تھا۔

عدنان دولت مند لڑکا تھا۔اسے تو امیر دوست کی تلاش تھی، مگر غلطی سے وہ ندیم جیسے غریب دوست کا انتخاب کر بیٹھا تھا۔

اس کے بعد عدنان نے وہ اسکول بھی چھوڑ دیا تھا ندیم جیسے غریب لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ندیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ کیا غریب ہونا اتنا بڑا قصور ہے؟ عدنان نے ایسا کیوں کیا، کیوں؟n

امیر کی ایمان داری

محمد ابوہریرہ مصلح۔ منچن آباد

کسی گاؤں میں امیر نامی ایک لڑکا رہتا تھا۔ اس کا باپ ایک غریب مزدور تھا اور محنت مزدوری کرتا تھا۔ مگر کسی نہ کسی طرح امیر کو اس کے باپ نے اسکول داخل کروایا۔ وہ روزانہ اسکول جاتا اور واپس آکر مدرسے میں قرآن پڑھنے جاتا۔ امیر بہت اچھا اور ایمان دار لڑکا تھا۔ ایک روز وہ اسکول سے واپس آرہا تھا تو راستے میں اسے ایک کپڑے کی گٹھری پڑی ہوئی ملی۔ اس نے وہ گٹھری اٹھالی اور چل پڑا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس کو ایک شخص ملا جس نے امیر سے پوچھا: "بیٹا! کیا راستے میں تم کو کپڑے کی گٹھری ملی ہے؟"

ایمان دار امیر فوراً بولا: "چاچا! مجھے گٹھری ملی تو ہے، مگر میں نہیں جانتا کہ یہ تمہاری ہے یا نہیں۔ میں تم سے اس گٹھری کی تین نشانیاں پوچھتا ہوں: اس کا رنگ کیا ہے، اس میں کیا تھا اور وہ چیز کتنی تھی؟"

یہ سن کر اس شخص نے جواب دیا: "اس کا رنگ پیلا تھا۔ اس میں سونا تھا، اور وہ تیس تولہ تھا۔"

یہ تینوں جواب درست تھے، اس لیے امیر نے وہ گٹھری اس شخص کے حوالے کر دی۔ اس شخص نے امیر کو چاندی کا ایک سکا دیا جو امیر نے لے لیا، مگر اس واقعے کی وجہ سے وہ مدرسے دیر سے پہنچا۔ جب قاری صاحب نے اس سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو امیر نے انھیں سارا واقعہ بتایا۔ اس کی ایمان داری کا سن کر قاری صاحب نے بھی اس کو ایک سکا دیا۔ اب اس کے پاس دو سکے ہو گئے تھے، اس نے ان دونوں سکوں سے سبزیوں کے بیج خریدے اور اپنی زمین میں بو دیے۔ کچھ عرصے بعد سبزیاں تیار ہو گئیں۔ اب وہ روزانہ گاؤں میں سبزیاں بیچا کرتا تھا جس کے بعد اس کی غربت ختم ہو گئی اور وہ سکون کی زندگی گزارنے لگا۔ n

آمنہ کی جیت

ثناء اکرم۔ کوٹ راجہ (سرگودھا)

"سنو آمنہ۔" آمنہ کلاس روم کی طرف جا رہی تھی کہ رمشا کی آواز سن کر رک گئی۔

"تم ہر وقت سر پہ دوپٹا کیوں اوڑھے رہتی ہو؟ اپنے بال کھلے کیوں نہیں رکھتیں؟" رمشا نے طنزیہ انداز سے کہا۔

اس کے ساتھ اس کی سب سے اچھی دوست شہلا بھی تھی، اس نے بھی اس موقع پر بولنا ضروری سمجھا اور کہا: "یہ بے چاری اپنے بال کیسے کھول سکتی ہے؟ اس کے بال تو بہت روکھے اور بے جان ہیں اور بہت چھوٹے بھی، اتنے برے لگتے ہیں جبھی تو یہ انہیں چھپا کر رکھتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

آمنہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "میرے بال اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں اور جیسے بھی ہیں، میں اس کا شکر ادا کرتی ہوں۔ ویسے بھی میں تو کبھی تم لوگوں کے عیب تلاش نہیں کرتی، تم ایسا کیوں کرتی ہو؟"

آمنہ کی بات سن کر رمشا نے کہا: "ہم میں کوئی عیب ہے ہی نہیں تو تم تلاش کیا کرو گی؟ اور اگر میرے بال ایسے ہوتے تو میں مہنگے سے مہنگا علاج کرواتی اور انھیں ٹھیک کروا لیتی۔"

اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ اور کہتیں، آمنہ تیزی سے اپنے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔

رمشا بہت مغرور اور منہ پھٹ لڑکی تھی۔ حالاں کہ اس کا خاندان بہت زیادہ امیر نہیں تھا، مگر پھر بھی وہ غریب اور سیدھی سادی لڑکیوں کی بے عزتی کرنا اپنا حق سمجھتی تھی اور کسی کو کچھ بھی کہہ دیتی تھی۔

آج اسکول میں تقریری مقابلہ تھا جس میں رمشا اور آمنہ نے بھی حصہ لیا تھا۔ تمام طالبات نے باری باری تقریریں کیں۔ پھر رمشا کی باری آئی۔ رمشا نے تقریر شروع کی تو بہت اچھے طریقے سے کی، مگر پھر اچانک وہ سب کچھ بھول گئی۔ کوشش کے باوجود اسے کچھ بھی یاد نہیں آیا۔ کافی دیر تک وہ اسٹیج پر کھڑی رہی، مگر ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ تمام لڑکیاں بہت حیران ہوئیں، بلکہ کچھ طالبات نے تو ہنسنا شروع کر دیا۔ رمشا کی مس بھی بہت حیران ہوئیں، کیوں کہ رمشا بہت اعتماد والی لڑکی تھی، انہیں اس سے اس قسم کی بالکل توقع نہیں تھی۔ غرض وہ چپ چاپ اسٹیج سے نیچے اتر آئی اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔

آخر اس مقابلے کے نتائج کا اعلان کیا گیا تو پتا چلا کہ آمنہ اعظم اس مقابلے میں فرسٹ آئی ہے۔ اب تو رمشا کو اور بھی شرمندگی محسوس ہوئی کہ جس لڑکی کا وہ ہمیشہ مذاق اڑاتی تھی اور اسے اس کی غربت اور سادگی کے طعنے دیتی تھی، اس لڑکی نے آج سب کے سامنے رمشا منیر کو ناکامی سے دوچار کیا ہے۔ آمنہ نے جب ٹرافی ہاتھوں میں اٹھائے چمکتی آنکھوں سے رمشا کی طرف دیکھا تو اسے لگا جیسے آمنہ کہہ رہی ہو: "جو لوگ دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں، وہ خود ایک دن سب کے سامنے مذاق بن جاتے ہیں۔" n

انور کے آنسو

محمد شعیب خان۔ واہ کینٹ

سارا دن بندر کا تماشا دکھانے کے بعد انور اپنے ابو کے ساتھ جھونپڑی میں واپس پہنچ چکا تھا۔ پہلے کی نسبت آج وہ اپنے آپ کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے ذہن پر عجیب سا بوجھ تھا۔ کچھ دنوں سے اُسے اپنے خیالات میں ایک تبدیلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ انور اپنے ابو اور امی کے ساتھ شہر سے دور ایک ویران جگہ پر رہتا تھا۔ اس کے دو چھوٹے بہن بھائی تھے۔ انھوں نے اپنے گھر میں ایک بندر پالا ہوا تھا۔ یہ بندر اس کے اور ابو کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ انور اور اس کے ابو صبح سویرے بندر کو ساتھ لے کر شہر کی طرف روانہ ہو جاتے اور شام کو واپس آجاتے۔ یہ بندر انور سے بھی بہت مانوس ہو چکا تھا۔ کبھی چھلانگ لگا کر اُس کے کندھے پر بیٹھنے کی کوشش کرتا اور کبھی عجیب عجیب حرکتیں کر کے انور کے ساتھ مذاق کرتا جنھیں دیکھ کر بچے بہت خوش ہوتے تھے۔ انور بھی اپنے بندر سے بہت محبت کرتا تھا۔ یہی بندر ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔

آج جب دونوں باپ بیٹے شہر پہنچے تو راستے میں انور نے اپنے ہم عمر بچوں کو اُجلے اُجلے کپڑے پہنے اسکول جاتے دیکھا۔ پہلے بھی اُس کی نظر بچوں پر پڑتی رہتی تھی، لیکن وہ ان پر توجہ نہ دیتا تھا۔ بچے ہنستے مسکراتے اسکول جا رہے تھے۔ اُن کی کندھوں پر خوب صورت رنگوں کے بیگ اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ انور کے ابو جہاں لوگوں کی بھیڑ دیکھتے، بندر کا تماشا دکھانے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب تماشا ختم ہوتا تو انور اور بندر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر پیسے جمع کرتے۔ پھر وہ گلی گلی گھوم کر کسی نکڑ پر لوگوں کو جمع کرتے، بلکہ ان کو دیکھ کر لوگ خود ہی کھنچے چلے آتے تھے، اس طرح ان کی روٹی چل رہی تھی۔

شام کو گھر آتے آتے انور کو بندر کی حرکتیں اچھی لگنے کے بجائے بری لگنے لگیں، حالاں کہ اس سے پہلے وہ اسی بندر کی حرکتوں پر جان دیتا۔ مگر آج نہ جانے اسے کیا ہوا تھا کہ ایک بار تو اس نے بندر کو دھکا بھی دے دیا۔ پھر کیا تھا، بندر بھی منہ بگاڑ کر جھونپڑی کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت انور کی امی اندر آگئیں اور دونوں کو منہ بنائے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ انھوں نے انور سے پوچھا تو وہ رونے لگا۔ امی پریشان ہو گئیں اور رونے کی وجہ پوچھی تو انور نے ان سے کہا: ”میں اسکول جانا چاہتا ہوں اور دوسرے بچوں کی طرح پڑھنا چاہتا ہوں۔“

یہ سُن کر اس کی امی بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے انور کے ابو سے بات کی راضی کر لیا تو وہ بھی انور کو اسکول میں پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے۔

چند روز بعد جب انور کے ابو، بندر کو ساتھ لے کر شہر کے لیے روانہ ہوئے تو انور بھی ان کے ساتھ تھا، مگر اس نے اسکول کی یونی فارم بھی پہن رکھی تھی اور اس کے کندھے پر نیلے رنگ کا چمک دار اسکول بیگ لٹک رہا تھا۔ اس کا داخلہ اسکول میں ہو چکا تھا۔ جیسے ہی اسکول آیا تو انور نے اپنے ابو کو سلام کیا اور ہاتھ ہلا کر اپنے دوست بندر کو الوداع کہا۔ بندر نے بھی اسے ہاتھ کے اشارے سے سیلوٹ کیا۔ انور کی بہت بڑی خواہش پوری ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے نکلنے والے خوشی کے آنسو کوئی نہیں دیکھ سکا۔

اپنا وطن

فاروق جان۔ کراچی

فاطمہ اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ ابو کمرے میں داخل ہوئے اور بولے: "فاطمہ بیٹی! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔"

فاطمہ نے جلدی سے کہا: "تو جلدی سنائیں ناں۔"

"ہم لوگ جلد لندن جائیں گے جہاں تم ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرو گی۔" ابو نے جواب دیا۔

"لیکن ابو! یہ کیا خوش خبری ہوئی کہ ہم اپنا ہی ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔" فاطمہ نے منہ بنا کر کہا۔

یہ سن کر ابو نے آنکھیں پھاڑ کر کہا: "بیٹا! تمہیں تو فخر کرنا چاہیے کہ تم دنیا کے ایک بڑے اور ترقی یافتہ ملک میں جا رہی ہو اور آئندہ زندگی بھی وہیں گزارو گی۔"

"کاش ابو! آپ کو یہ خیال نہ آتا۔" فاطمہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"بیٹا! تم یہاں کا ماحول دیکھ رہی ہو، ہر جگہ گندگی کے ڈھیر، لوگ اپنے گھروں کی گندگی باہر ڈال دیتے ہیں، سڑکوں پر گاڑیوں کا دھواں اور پھر آئے روز قتل و غارت گری، مہنگائی، لوٹ کھسوٹ، یہاں کے حالات تو......"

فاطمہ نے بیچ میں ابو کی بات کاٹ دی: "لیکن ابو! اپنے ملک کو اس حال کو پہنچانے میں زیادہ حصہ ہمارا اپنا ہی تو ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے صاف ستھرا رکھیں، ہر طرح اس کی حفاظت کریں، اپنا گھر اگر گندا ہو تو کیا اسے صاف کرنا ہماری ذمہ داری نہیں؟ اپنے گھر کو چھوڑ کر غیر ملکوں میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے کہ اپنے ہی گھر کو صاف کرلیں۔" اتنا کہہ کر فاطمہ خاموش ہو گئی۔

"بس میں نے کہا ناں کہ تم باہر جانے کی تیاری کرلو۔" یہ کہہ کر فاطمہ کے ابو اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئے۔ کافی دیر تک وہ کروٹیں بدلتے رہے اور اپنی بیٹی کی کہی ہوئی باتوں پر غور کرتے رہے۔ یکایک انہیں احساس ہوا کہ فاطمہ صحیح کہہ رہی ہے۔ پھر انھیں اپنی سوچ پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ پتا نہیں مجھ جیسے کتنے ہی لوگ باہر کے ملکوں اور غیر اقوام کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس کے بجائے اگر ہم شروع سے اپنے ملک کی خدمت کرتے اور اسے سنوارنے اور ترقی دینے کی کوشش کرتے تو آج ہمارا شمار بھی ترقی یافتہ اقوام میں ہوتا۔ دیر سے سہی بہر حال ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور انھوں نے پاکستان سے باہر جانے کا فیصلہ بدل دیا۔ اس کے بعد اطمینان سے سو گئے۔

صبح چھٹی تھی، اتوار کا روز تھا۔ ابو اٹھتے ہی فاطمہ کے کمرے میں داخل ہوئے اور اس سے کہا: "بیٹا فاطمہ! تم صحیح کہہ رہی ہو، ہم اپنے اس ملک، اس وطن کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، بلکہ یہیں رہیں گے، اس کی حفاظت کریں گے اور اسے ترقی دیں گے۔"

فاطمہ کو بہت خوشی ہوئی کہ اس کے ابو اس کی بات کو سمجھ گئے ہیں n۔

عاطف کی لائبریری

شائستہ انجم، واہ کینٹ

اسکول میں آدھی چھٹی کا گھنٹہ بجا تو کچھ بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے اور کچھ بچے جنھوں نے اگلے پیریڈ کا یاد نہیں کیا تھا، وہ جلدی جلدی سبق یاد کرنے لگے، جب کہ کچھ بچے شرارتوں میں مصروف ہو گئے۔ ان میں سبق سے بعض بچے گپ شپ بھی کر رہے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آپس میں لڑنے لگے۔

مگر روزانہ کی طرح آج بھی عاطف اس سارے ہنگامے سے بے خبر نہایت دل چسپی سے بچوں کا صفحہ "کرنیں" پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کے ہم جماعت جانتے تھے کہ عاطف کو مطالعے کا بہت شوق ہے اور یہی وجہ تھی کہ اسکولوں کے ذہنی آزمائش کے پروگرام یا حالات حاضرہ اور معلومات عامہ کے مقابلوں میں اساتذہ فوراً عاطف کا نام دے دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد حسب توقع دوسرے بچوں کی نسبت عاطف کی کارکردگی بہت نمایاں ہوتی اور وہ انعامات واعزازات ضرور حاصل کرتا تھا۔ مطالعے کے شوق کی وجہ سے اسے نہ صرف اپنے ملک، بلکہ بیرونی دنیا کے بارے میں بھی وسیع معلومات تھیں۔ اس کے سبھی ساتھی اس پر رشک کرتے تھے اور اساتذہ بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ پاتے تھے۔ آخر اس کے ہم جماعتوں نے بھی عاطف کی دیکھا دیکھی مطالعے میں دل چسپی دکھانی شروع کر دی۔ عاطف نے بچوں کا صفحہ "کرنیں" پڑھنے کے بعد اپنے ساتھی ہم جماعت کو پڑھنے کے لیے دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک دوست کو بچوں کا رسالہ بھی پڑھنے کے لیے دیا، مگر ساتھ ہی سختی سے تاکید کی کہ وہ بچوں کا میگزین خراب ہونے سے بچائے جس پر اس کے دوست نے اسے کنجوس ہونے کا طعنہ دیا تھا۔

یہ سن کر عاطف بولا: "میں کنجوس نہیں ہوں، بلکہ اخبارات اور کتابوں سے محبت کرتا ہوں، اس لیے ان کی حفاظت بھی کرتا ہوں۔"

کچھ ہی عرصے میں اسکول میں وقفے کی گھنٹی میں یا چھٹی کے بعد عاطف کے تمام ہم جماعت نہایت جوش وجذبے اور خوشی سے ایک دوسرے سے بچوں کے رسالوں، صفحات اور میگزین کا تبادلہ کرنے لگے۔ اب اساتذہ بھی خوش اور حیران تھے کہ کچھ بے حد شرارتی بچوں میں بھی خوش گوار تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ فارغ وقت میں دوسرے کو ستانے اور لڑنے کے بجائے دل چسپی سے مطالعہ کرتے اور اس کا سہرا عاطف کے سر جاتا تھا۔

عاطف موسمی بخار کی وجہ سے کچھ دن اسکول نہ آ سکا تو ایک دن تمام بچے اس کا حال معلوم کرنے کے لیے اس کے گھر پہنچ گئے۔ عاطف کی امی نے سب بچوں کو عاطف کے کمرے میں بھیج دیا۔ یہاں عاطف کے پلنگ کے قریب اس کے قد کے برابر ایک بڑی سی کتابوں کی الماری رکھی تھی جس میں بچوں کے رسالے، معلوماتی کتابیں اور بچوں کے صفحات پر مشتمل اخبارات نہایت سلیقے اور تاریخ کی مناسبت سے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ تمام بچے عاطف کی لائبریری دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور پھر ان سبھی نے تمام کتابیں پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

عاطف نے بہت خلوص اور انکساری سے اپنی تمام کتابیں اور اخبار اپنے تمام دوستوں کو دکھائے اور کہا: "میں اپنی تمام درسی کتابیں بھی صاف ستھری رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور اگلے درجے میں جانے کی صورت میں اپنی کتابیں کسی مستحق بچے کو دے دیتا ہوں۔"

کچھ بچوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ بھی ایسے قابل ستائش کام کرنے کی کوشش کریں گے۔ اپنے ہم جماعتوں کو اپنی لائبریری میں دل چسپی لیتے دیکھ کر عاطف نے ان سے کہا: "میں یہ تمام چیزیں آپ سب کو پڑھنے کے لیے دے سکتا ہوں، لیکن اس کے لیے آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیسا وعدہ؟" اس کے تمام ساتھی حیرت سے بولے۔

"یہ کہ آپ ان تمام کتابوں کو سنبھال کر رکھیں گے۔ نہ تو ان کے صفحات پھاڑیں گے اور نہ ہی قلم سے کہیں نشان لگائیں گے، بلکہ پڑھنے کے بعد اسی حالت میں تمام کتابیں مجھے واپس کر دیں گے۔" عاطف نے کہا تو انھوں نے ہم آواز ہو کر وعدہ کر لیا۔

سچ تو یہ ہے کہ آج عاطف بہت خوش تھا، کیوں کہ اس کا پسندیدہ مشغلہ اب اس کے بہت سے ساتھیوں کا بھی پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔n

ایقان کا عہد

حماد سارنگ۔ کراچی

''اٹھو ایقان! اسکول کا وقت ہو گیا۔'' امی نے مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک مختصر سی انگڑائی لی اور پھرتی سے اٹھ بیٹھا، پھر حسب معمول جلدی جلدی تیار ہوا اور ناشتہ کر کے اسکول چل دیا۔ جب میں بڑی سڑک پر پہنچا تو اچانک کوئی مجھ سے آ کر ٹکرا گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہ کوئی نابینا تھا اور مجھ سے سڑک پار کرانے کی درخواست کر رہا تھا۔ میں جلدی میں تھا، اس لیے میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور آگے بڑھ گیا۔ اس بھاگ دوڑ کی وجہ سے میں اسکول ٹھیک وقت پر پہنچا۔ کلاس میں بیٹھے ابھی پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ دانش میرے پاس آیا اور بولا: ''ایقان! مجھے وہ کاپی دے دو جس میں سر نے تمھیں سوالات لکھوائے تھے۔''

میں نے طنزیہ نظروں سے دانش کی طرف دیکھا۔ کاپی حالاں کہ میرے پاس تھی، مگر میں نے جان چھڑانے کو کہہ دیا: ''میں وہ کاپی گھر بھول آیا ہوں۔''

یہ سن کر دانش خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد پیریڈ شروع ہوا تو درمیان میں پیچھے سے احمد نے کہا کہ مجھے اپنا اسکیل دے دو۔ اسکیل بھی بستے میں تھا، لیکن میں نے احمد کو منع کر دیا، لیکن اس طرح میں خود بھی اسکیل استعمال نہ کر سکا، کیوں کہ اس صورت میں میرے جھوٹ کا پول کھل جاتا۔

اسکول کی چھٹی ہوئی تو میں نے بستہ سنبھالا اور اپنے گھر چل دیا۔ راستے میں، میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک چھوٹے سے بچے کو اسکول کے بہت سے بڑے لڑکے مل کر مار رہے تھے۔ میں نے اسے ان سے بچانے کے بجائے مزے سے کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد کچھ لوگوں کو آتے دیکھ کر وہ سب لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے اور میں پٹنے والے بچے کو وہیں روتا چھوڑ کر گھر چلا گیا۔

جب میں گھر پہنچا تو دروازے پر کسی فقیر کو کھڑا پایا۔ امی کبھی کسی فقیر کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی تھیں۔ گھر میں داخل ہوا تو برآمدے میں ڈاکٹر صاحب دکھائی دیے، وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے تو میں نے انھیں سلام کیا اور بستہ رکھنے کمرے میں چلا گیا۔

ڈاکٹر صاحب ابا جان کے بہت اچھے دوست تھے، اس لیے اکثر آتے رہتے تھے اور جب بھی آتے مجھ سے میرے گزرے دن کی رپورٹ ضرور معلوم کرتے۔ بستہ رکھ کر میں ان کے پاس جا بیٹھا اور انھوں نے وہی پرانا سوال کیا: ''ہاں بھئی ایقان! آج کیا کیا تم نے؟''

اس پر میں نے انھیں نابینا شخص کا، اسکول کا، بچے کی پٹائی اور فقیر کا واقعہ سچ سچ سنا دیا۔ یہ سب سن کر ایک لمحے کو انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولے: ''تم اسکول میں یہی کچھ سیکھتے ہو! یہ تمھاری کونسی کتاب کا سبق ہے جس کا تم نے آج مظاہرہ کیا ہے؟''

ان کے سوال پر میں گڑبڑا گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا: ''تم اسکول کیوں جاتے ہو؟''

میں نے دھیرے سے کہا: ''علم حاصل کرنے!''

''اور تمھارے علم کا عمل یہ ہے جو تم نے آج کیا ہے؟ ایسے علم کا کیا فائدہ جس کا عمل انتہائی ناقص ہو، ایسے علم سے تو جہالت بہتر ہے جو لوگوں سے نفرت کرنا نہیں سکھاتی۔''

تھوڑی دیر کو وہ رکے اور پھر بولے: ''تم ڈاکٹر بننا چاہتے ہو۔ اگر ڈاکٹر بننے کے بعد بھی تم نے لوگوں کے ساتھ یہی سلوک کیا تو پھر تم ان کے ہمدرد نہیں بلکہ ان کے دشمن بن جاؤ گے۔ مجھے تم سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔''

میں ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ واقعی میں نے بہت بڑی غلطی، بلکہ لگاتار کئی غلطیاں کی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے معافی مانگی اور آئندہ اچھے کام کرنے کا عہد کیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی اور میں بے عمل کہلاتا۔ n

بددعا

انوارالحق۔ کبیر والا

اسکول کی چھٹی ہوئی تو کلاسوں سے بچے نکل کر شور مچاتے ہوئے باہر کی طرف دوڑے۔ان میں شرجیل بھی شامل تھا، لیکن وہ بھاگنے دوڑنے کے بجائے پرسکون انداز میں چلتا ہوا چلا جارہا تھا۔شرجیل کا طریقہ تھا کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح بھاگ دوڑ کر اسکول سے نہیں نکلتا تھا، بلکہ ہمیشہ سکون سے چلتا تھا۔

اسکول سے باہر نکلا تو شرجیل کو ایک باباجی کھڑے نظر آئے۔وہ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

شرجیل ان کی طرف متوجہ ہوا اور کہا:"باباجی! کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں؟"

باباجی نے جواب دیا:"بیٹا! کوئی شریر لڑکا مجھ اندھے کی چھڑی لے کر بھاگ گیا ہے۔اب میں گھر کس طرح جاؤں گا؟ اسی پریشانی کے عالم میں یہاں کھڑا ہوں۔"

شرجیل کو باباجی پر بہت ترس آیا۔اس نے انہیں ادب سے پکڑا اور کہا:"باباجی! آپ فکر نہ کریں۔میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آؤں گا اور آپ کو نئی چھڑی بھی دلوادوں گا۔آپ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیں۔پہلے میں آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں۔"

اس کے بعد شرجیل باباجی کو اپنے گھر لے آیا۔انہیں پانی پلایا اور کھانا بھی کھلایا جس کے بعد اس نے باباجی کو ایک نئی چھڑی لاکر دی اور انہیں ان کے گھر پہنچادیا۔

بوڑھے باباجی نے شرجیل کو ڈھیروں دعائیں دیں۔

اس واقعے کو بیس سال بیت گئے۔وقت گزرتا رہا اور شرجیل پڑھ لکھ کر ایک بڑے دفتر میں ملازم ہوگیا۔ایک دن وہ اپنے دفتر جارہا تھا کہ اسے راستے میں سڑک کنارے ایک شخص کھڑا دکھائی دیا جو بھیک مانگ رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھی۔شرجیل نے اس شخص کو غور سے دیکھا تو اسے پہچان گیا۔وہ مشتاق تھا۔اس کے بچپن کا دوست اور کلاس فیلو!

شرجیل تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور کہا:"مشتاق! مجھے پہچانا؟ میں شرجیل ہوں۔"

مشتاق نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔وہ سرد آہ بھر کر بولا:"ہاں شرجیل! یہ میں ہی ہوں؟"

"مگر تمہارا یہ کیا حال ہوگیا ہے؟" شرجیل نے پوچھا تو مشتاق کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

کچھ دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا، لمبی آہ بھری اور کہا:"کیا بتاؤں! تمہیں تو یاد ہوگا کہ اسکول کے زمانے میں، میں کس قدر شرارتی تھا۔ایک روز میں نے ایک اندھے کی لاٹھی چھین لی تھی جس پر اس نے مجھے خوب برا بھلا کہا اور یہ بددعا دی کہ اللہ کرے تو بھی مجھ جیسا ہو جائے۔وہ بددعا کچھ دل سے نکلی تھی، اس لیے اس نے فوراً اثر کیا۔ایک دن میں چلتی بس سے گرا اور زندگی بھر کے لیے لنگڑا ہوگیا۔پھر میرے حالات بھی بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔اب نوبت یہ آگئی ہے کہ میں بھیک مانگ رہا ہوں۔"

مشتاق کی کہانی سن کر شرجیل کو ایک جھٹکا لگا۔اسے یاد آگیا کہ جس اندھے کی اس نے مدد کی تھی اور اس کی دعائیں لی تھیں۔اسی اندھے کی لاٹھی مشتاق نے چھین لی تھی اور پھر اس کی بددعائیں بھی لی تھیں۔

چند لمحوں تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مشتاق کو دیکھتا رہا، پھر بولا:"آؤ مشتاق! میرے ساتھ چلو۔میں تمہارا علاج کراؤں گا اور تمہاری ہر طرح کی مدد بھی کروں گا۔"

مشتاق نے ڈبڈبائی آنکھوں سے شرجیل کی طرف دیکھا اور اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔n

بیل واپس مل گئے

محمد حماد خان۔ واہ کینٹ

ایک بوڑھی عورت اپنے بیٹے بابو کے ساتھ جھونپڑی میں رہتی تھی۔ان کے پاس دو بیل اور تھوڑی سی زمین تھی۔ بابو صبح صبح دونوں بیلوں کو لے کر کھیتوں میں چلا جاتا اور ہل چلاتا جس کے نتیجے میں جو تھوڑی بہت فصل ہوتی، اس سے دونوں ماں بیٹے کا بہ مشکل گذارہ ہوتا تھا۔بابو دن بھر کھیتوں میں کام کر کے تھک جاتا اور رات کو بیلوں کے پاس اس لیے سوتا تھا کہ کہیں اس کے بیل کوئی چوری نہ کر لے۔

لیکن چور بھی نہ جانے کب سے اس کے بیلوں کی تاک میں تھے ،ایک رات انہیں موقع مل گیا اور وہ دونوں بیل چوری کر کے لے گئے۔ بابو صبح سو کر اٹھا تو بیل غائب تھے۔اب تو ماں بیٹا دونوں پریشان ہو گئے۔اسی وقت بابو کی نظر قدموں کے نشانوں پر پڑی۔اس نے ماں سے کہا:"میں چوروں کے قدموں کے نشانوں کا پیچھا کر کے اپنے بیل چھڑا لاؤں گا۔"

ماں نے بیٹے کو راستے میں کھانے کے لیے روٹی دی اور دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔بابو دن بھر چلتا رہا۔ راستے میں اسے ایک بوڑھا فقیر ملا جس نے بابو سے کہا کہ میں کئی دن سے بھوکا ہوں، مجھے روٹی دے دو۔بابو نے بوڑھے فقیر کو اپنی روٹی میں سے تھوڑی سی دے دی۔

فقیر بہت خوش ہوا۔اس نے بابو کو گوند اور ماچس دیتے ہوئے کہا:"یہ دونوں چیزیں رکھ لو، تمہارے کام آئیں گی۔"

بابو دونوں چیزیں لے کر چل پڑا۔راستے میں اس کی نظر دو سانپوں پر پڑی جو روٹی کے ایک ٹکڑے پر لڑ رہے تھے۔ بابو نے اپنی روٹی میں سے تھوڑی سی دونوں کو دے دی۔وہ دونوں بہت خوش ہوئے اور بابو سے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ بابو نے سارا واقعہ بتایا تو وہ بھی اس کی مدد کے لیے ساتھ چل پڑے۔ چلتے چلتے بابو نے دیکھا کہ دو بچھو آپس میں لڑ رہے تھے۔بابو کو بھی بھوک لگی تھی، مگر اس نے باقی روٹی خود کھانے کے بجائے بچھوؤں کو ڈال دی۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئے اور وہ بھی لڑکے کی مدد کے لیے چل پڑے۔وہ سب چوروں کے قدموں کے نشانوں کا پیچھا کرتے کرتے ایک گھر کے پاس پہنچ گئے۔اس وقت تک رات ہو چکی تھی۔ سانپ اندر جا کر بھوسے پر بیٹھ گیا اور کہا کہ جیسے ہی چور آگ جلانے کے لیے بھوسا اٹھائیں گے تو میں ان کو ڈنک مار دوں گا۔ بچھو جا کر ماچس پر بیٹھ گیا اور کہا کہ جیسے ہی چور آگ کے لیے ماچس پکڑیں گے میں ڈنک مار دوں گا۔اسی دوران گوند پورے برآمدے میں پھیل گیا اور کہا کہ جیسے ہی چور باہر نکلیں گے، میں ان سے چپک جاؤں گا۔ تم جا کر اپنے بیل کھولنا اور لے جانا۔ بابو نے جیسے ہی بیل کھولے اور نکلنے لگا تو چور جاگ گئے اور روشنی کرنے کے لیے ایک ہاتھ ماچس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دوسرا بھوسے کی طرف ، مگر وہاں تو بچھو اور سانپ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔دونوں نے چوروں کو ڈنک مارے تو وہ چیختے ہوئے باہر دوڑے جہاں پہلے ہی گوند پھیلا ہوا تھا،دونوں چور اس پر پھسل کر گرے اور چپک گئے۔ بابو اپنے بیل لے کر چلا گیا، مگر جانے سے پہلے اس نے سانپ اور بچھو کا شکریہ ادا کیا جن کی مدد سے وہ اپنے بیل دوبارہ حاصل کر سکا تھا۔n

بخت بی بی

شائستہ انجم۔واہ کینٹ

بخت بی بی گاؤں کے بالکل آخری حصے میں رہتی تھی۔اس کے پاس تین گھڑے تھے جن میں وہ روز دور نہر سے پانی بھر کر لاتی اور اپنے صحن میں رکھ دیتی۔تپتی گرمیوں میں راہ چلتے مسافر،اسکول کے بچے یا ضرورت منداس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور پینے کے لیے پانی مانگتے تو بخت بی بی خوشی خوشی لوگوں کو پانی پلاتی۔بعض اوقات اس کے اپنے لیے بھی پانی نہ بچتا،مگر وہ دوسروں کو پانی پلا کر دلی سکون حاصل کرتی تھی۔

ایک دن بخت بی بی نے نہر کے کنارے اپنے کچھ کپڑے اور برتن دھوئے،پھر تینوں گھڑے پانی سے بھر لیے۔اس کے بعد سر پر دھلے کپڑوں کی گٹھری اور دھلے ہوئے برتنوں کا پرات دھرے اور پہلو میں گھڑے رکھے وہ گھر کی طرف روانہ ہوئی۔کافی فاصلہ طے کر چکی تو اسے یاد آیا تیسرا گھڑا تو نہر کے کنارے ہی بھول آئی ہے،مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟وہ گھر کے قریب پہنچ چکی تھی۔اگلے دن بخت بی بی بیمار پڑ گئی،مگر اس کے گھر سے پانی پینے لوگ اور بچے آتے رہے جس کے نتیجے میں دونوں گھڑوں کا پانی ختم ہو گیا۔کچھ مسافروں نے بخت بی بی کا دروازہ بجایا اور پانی مانگا تو اس نے لیٹے لیٹے کم زور آواز میں معذرت کر لی۔

ادھر تیسرا گھڑا پانی سے بھرا زمین پر ویسے ہی پڑا تھا کہ ادھر سے ایک مزدور کا گزر ہوا جو اپنے گدھے پر مٹی لادے کہیں جا رہا تھا۔اچانک گدھے کا پاؤں زمین پر پڑے پتھر سے ٹکرایا اور اس کی پیٹھ پر لدی مٹی پھسل کر گرنے لگی جو کچھ زمین پر اور باقی گھڑے میں گر گئی۔

بخت بی بی کو بستر پر پڑے دو دن گزر چکے تھے۔وہ یہ سوچ کر دکھی ہو رہی تھی کہ اس کے گھر پانی پینے والے لوگ آتو رہے تھے،مگر مایوس واپس جا رہے تھے۔ان میں سے کسی نے اس کا حال تک نہ پوچھا،بلکہ پانی نہ ملنے پر منہ بنا کر چلے گئے۔

چار دن بعد جب بخت بی بی ٹھیک ہوئی تو اس نے یہ سوچ کر گھڑے اٹھا لیے کہ لوگ پینے کے پانی کی امید پر اس کے گھر آتے ہیں،وہ انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتی،اس لیے نہر کی طرف چل پڑی،مگر اس کے دل میں یہ احساس رہا کہ کسی نے اسے پوچھا کیوں نہیں۔

نہر کے کنارے سوکھی جھاڑیاں اور ریتیلی زمین ہوا کرتی تھی۔مگر آج بخت بی بی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا تیسرا گھڑا وہیں موجود تھا،مگر اس میں رنگا رنگ پھول لہلہا رہے تھے۔وہ پھول شاید خود بخود اُگ گئے تھے۔اسے یوں لگا کہ جو کام اس نے اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا تھا،اس کا انعام ان پھولوں کی صورت میں مل گیا ہے۔

آج گھر واپسی پر وہ پانی کے گھڑوں کے ساتھ خوب صورت پھولوں کا گھڑا بھی لیے خوشی خوشی چلی آ رہی تھی۔n

بند دروازہ

ڈاکٹر محمد عبید اللہ، اڈا چوپڑ ہٹہ

وہ مسلسل دروازے پر دستک دے رہا تھا، مگر دروازہ نہ کھلا۔

وہ آج کل بہت بے چین رہتا تھا۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ چڑچڑاہٹ نے اسے جکڑ لیا تھا۔ دفتر میں بھی ساتھیوں سے اس کا رویہ بدل چکا تھا۔

دستک دیتے دیتے تھک کر وہ سامنے سیڑھی پر بیٹھ گیا اور اس کے دماغ میں ماضی کے دریچے کھلتے چلے گئے۔ جب وہ طالب علم تھا تو تفکرات سے پاک زندگی گزار رہا تھا۔ جب بھی اسکول سے گھر آتا تو گھر کا دروازہ کھلا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ دستک دیے بغیر اور بلا روک ٹوک کے گھر میں داخل ہو جاتا تھا، بلکہ وہ اکثر اپنی ماں سے کہتا تھا: "امی جی! گھر کا دروازہ بند رکھا کریں۔ آج کل حالات بہت خراب ہیں۔"

لیکن اس کی ماں ہنس کر ٹال دیتیں اور اس سے کہتیں: "بیٹا! جلدی ہاتھ منہ دھو لو، کھانا تیار ہے۔"

وقت گزرتا گیا اور اس نے ایم اے بھی کر لیا۔ ماں کی دعا سے اسے ایک اچھی نوکری بھی مل گئی، پھر اس کی شادی بھی ہو گئی۔ مگر اب بھی وہی صورتِ حال تھی۔ وہ جب بھی شام کو گھر آتا تو گھر کا دروازہ کھلا پاتا جس پر وہ ماں سے ناراض ہوتا تھا۔

آج جب وہ گھر آیا تو دروازہ بند تھا، کیوں کہ اب ماں دنیا سے جا چکی تھی۔ وہ گہری سوچوں میں گم تھا۔ آنسو مسلسل اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ گلی سے گزرتی اماں سکھاں نے جب اسے دیکھا تو آگے بڑھ کر اسے تھپکی دے اور بولیں: "ریاض بیٹا! کیا ہوا؟ میری بات ہی نہیں سن رہے، کتنی دیر سے بلا رہی ہوں۔"

اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے اور بولا: "اماں جی! دروازہ نہیں کھلا تھا، اس لیے ذرا ادھر بیٹھ گیا اور اونگھ آ گئی۔
"

"ریاض تم اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟ کیا بات ہے؟"

اماں سکھاں نے پوچھا تو ریاض ٹال مٹول کرنے لگا، لیکن ان کے اصرار پر اس نے کہا: "آج امی کی یاد بہت آ رہی ہے۔ جب تک وہ زندہ تھیں، میں ان سے لڑتا تھا کہ دروازہ کھلا نہ رکھا کرو، لیکن ان کے جانے کے بعد دروازے کو ہمیشہ بند پایا ہے۔ میری بیوی کو تو میری دستک سنائی ہی نہیں دیتی۔ بڑی دیر سے دروازہ کھولتی ہے۔ یہ بند دروازہ مجھے امی کی یاد بڑی شدت سے دلاتا ہے۔"

اماں سکھاں نے کہا: "بیٹا! تمھاری امی کوئی نادان عورت نہیں تھی۔ وہ بہت سمجھ دار اور محبت کرنے والی تھی۔ جب بھی تمھارے آنے کا وقت ہوتا، وہ دروازہ کھول دیتی تھی اور چھت پر جا کر دروازے کو تکتی رہتی تھی کہ میرا لال آئے تو اسے انتظار نہ کرنا پڑے۔ باقی سارا دن وہ دروازہ بند رکھتی تھی۔"

ریاض کو جب یہ پتا چلا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ پوری عمر اپنی ماں کو بے پروا سمجھتا رہا تھا، لیکن بے پروا وہ خود تھا۔ وہ اپنی ماں کی محبت کو سمجھ تک نہ سکا۔n

بندر کا دل

محمد حماد خان۔ واہ کینٹ

ایک مگرمچھ اور بندر میں بہت گہری دوستی تھی۔ مگرمچھ تالاب میں رہتا تھا جب کہ بندر تالاب کے کنارے اگے ہوئے ایک گھنے درخت پر رہتا تھا۔ بندر اور مگرمچھ روزانہ تالاب کے کنارے بیٹھ کر خوب باتیں کیا کرتے تھے۔ بندر اپنے دوست مگرمچھ کے لیے روزانہ کھانے کے لیے میٹھی میٹھی چیزیں لاتا تھا۔

ایک روز مگرمچھ کے ایک مکار دوست نے اس سے کہا: ”تمہارا دوست بندر تمہارے لیے کتنی میٹھی میٹھی اور مزے دار چیزیں لاتا ہے۔ اس کا دل بھی اس کی لائی ہوئی چیزوں کی طرح میٹھا ہو گا۔ کسی روز اس کو پکڑ لو، جب ہم اس کا دل نکال کے کھائیں گے تو مزہ آجائے گا۔“

مگرمچھ اپنے اس مکار دوست کی باتوں میں آ گیا۔ اگلے روز جب بندر میٹھی میٹھی چیزیں لے کر مگرمچھ سے ملنے آیا تو اس نے بندر کو پکڑ کر تالاب کے اندر گھسیٹ لیا۔

یہ دیکھ کر بندر گھبرا گیا، مگر اس نے اپنے حواس پر قابو رکھا اور مگرمچھ سے کہا: ”ارے دوست! یہ کیا کر رہے ہو تم؟“

مگرمچھ بولا: ”میرا ایک دوست کہہ رہا تھا کہ تمہارا دل بھی تمہاری لائی ہوئی چیزوں کی طرح میٹھا ہو گا، اس لیے آج میں تمہارا دل کھاؤں گا۔“

یہ سنتے ہی بندر بولا: ”پیارے دوست! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ آج میں اپنا دل درخت پر بھول آیا ہوں۔“

مگرمچھ نے یہ سنتے ہی بندر کو چھوڑ دیا۔ بندر پھرتی سے چھلانگ لگا کر تالاب سے باہر نکلا اور درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ مگرمچھ نے کہا: ”لاؤ، اب اپنا دل مجھے دے دو۔“

بندر بولا: ”بے وقوف دوست! بھلا میں اپنا دل درخت پر کیسے بھول سکتا ہوں؟ کیا تم اپنا دل نکال کر پانی میں رکھ سکتے ہو۔ جاؤ آج سے میری اور تمہاری دوستی ختم!“

اب تو مگرمچھ اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے بندر سے معافی مانگی، مگر بندر نے اس کی معافی قبول نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مگرمچھ نے نہ صرف ایک اچھا دوست گنوا دیا، بلکہ وہ ان میٹھی میٹھی چیزوں سے بھی محروم ہو گیا جو بندر اس کے لیے روز لایا کرتا تھا۔n

بینگن کون کھائے گا؟

رجاء جمال۔ کراچی

جاوید کافی دیر سے اپنی بڑی بہن شکیلہ کو ستا رہا تھا۔ پہلے تو وہ اسے نظر انداز کرتی رہی، مگر جب وہ باز نہ آیا تو غصے سے بولی: ”چپ ہوتے ہو یا نہیں، مار مار کر بھرتا بنا دوں گی۔“

جاوید شرارتی تو تھا، مگر کھانے پینے کا شوقین بھی تھا، اس نے شکیلہ کے منہ سے بھرتے کا نام سنتے ہی چٹخارے لیتے ہوئے کہا: ”بھئی مجھے تو بھرتا بہت پسند ہے، آلو کا بھرتا اور خاص طور سے بینگن کے بھرتے کا تو جواب ہی نہیں، وہ بھی گرما گرم پراٹھوں کے ساتھ!“

شکیلہ سمجھ گئی کہ وہ اپنے شرارتی بھائی سے کبھی نہیں جیت سکے گی، اس لیے بولی: ”میرے پیٹو بھائی! تمھیں ہر وقت کھانے پینے کی فکر لگی رہتی ہے۔ بینگن کا بھرتا کھاؤ گے؟“

مگر مسئلہ بینگن کے بھرتے کا نہیں تھا، بلکہ شرارتی جاوید تو بہن کو پریشان کرنا چاہتا تھا، اس لیے جھٹ سے بولا: ”لو بھلا بتاؤ، کیا بینگن کا بھرتا کھانے کی چیز ہے، مجھے تو بگھارے بینگن پسند ہیں۔“

اتنے میں ان کی امی آ گئیں۔ وہ ان دونوں بہن بھائی کی تکرار کافی دیر سے سن رہی تھیں اور اسی کو ختم کرانے آئی تھیں، مگر جب انھوں نے بگھارے بینگن کا ذکر سنا تو بولیں: ”جانتے ہو کہ بگھارے بینگن کہاں کے مشہور ہیں؟“

جاوید جلدی سے بولا: ”حیدر آباد دکن کے۔“

”اونھ کھٹے ہوتے ہیں، ان میں بعض لوگ املی بھی ڈالتے ہیں، مجھے تو اچھے نہیں لگتے نہ بینگن کا بھرتا اور نہ بگھارے بینگن!“ شکیلہ نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ پھر بولی: ”اکبر بیربل والی کہانی میں اکبر بادشاہ نے بینگن کو وہ سبزی قرار دیا تھا جس میں کوئی گن یا خوبی نہ ہو۔“

یہ سنتے ہی جاوید بولا: ”تمھیں یہ بھی یاد ہوگا کہ اکبر بادشاہ نے بیربل سے کہا تھا کہ یہ ”بادشاہ“ سبزی ہے، اسی لیے اس کے سر پر سبز پتوں کا تاج ہوتا ہے۔“

شکیلہ کہاں چوکنے والی تھی، بولی: ”اونھ بیربل تو تھالی کا بینگن تھا، جدھر تھالی جھکی اسی طرف لڑھک گیا۔“

امی نے دونوں کو چپ کرانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہیں۔ شکیلہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی کہ بینگن اچھی سبزی نہیں ہے، نہ اس کا بھرتا مزے دار ہوتے ہیں اور نہ بگھارے بینگن۔

دوسری طرف جاوید مسلسل بہن کو زچ کر رہا تھا۔ اس نے ایک دم چونک کر کہا: ”اس دن پکنک پر بھرے ہوئے اچاری بینگن مزے لے لے کر کون کھا رہا تھا؟“

جب امی نے دیکھا کہ بحث خواہ مخواہ بڑھتی جا رہی ہے تو انھوں نے دونوں کو چپ کراتے ہوئے کہا: ”دیکھو بچو! یہ سبزیاں، ترکاریاں سب اللہ نے پیدا کی ہیں۔ ان میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ سب کا اپنا مزہ ہوتا ہے، کبھی کسی کی برائی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ہر سبزی ہر ترکاری کو کھا کر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ ہمیں کھانے کو تو دے رہا ہے۔“

امی کی بات سن کر جاوید نے مسکرا کر اپنی بہن شکیلہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دی۔n

بڑا امتحان

شیخ عبدالحمید عابد۔ کاموںکے

ہما اپنے ماں باپ کی بہت لاڈلی بیٹی تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن اور وہ بھی سب سے چھوٹی، لیکن اچھی عادات کی مالک تھی۔ پڑھائی پر پوری توجہ دیتی، ٹیچرز کا احترام کرتی۔ لیکن نماز نہیں پڑھتی تھی، جب کہ اس کے گھر والے پابندی سے نماز پڑھتے تھے۔ اسکول کا کام، ٹی وی یا کیبل چھوڑ کر وضو کر کے نماز پڑھنا اسے بہت مشکل لگتا تھا۔ اب تو سالانہ امتحان سر پر تھے جس کی تیاری بھی کرنی تھی۔ اس بار مقابلہ سخت تھا۔ کلاس کی کئی لڑکیاں بھرپور تیاری کر رہی تھیں۔ ہما نے امتحان کی فکر میں ٹی وی کیبل بھی چھوڑ دیا تھا۔ مگر نماز کی طرف وہ اب بھی نہیں آئی۔

پھر امتحان شروع ہوئے اور ایک ایک کر کے تمام پرچے ہو گئے، کل آخری پرچہ اسلامیات کا تھا۔ ہما نے یاد کرنا شروع کیا، یکایک ایک سطر پر اس کی نظر جم گئی۔ روز قیامت سب سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہوگا۔ آگے لکھا تھا: ہم دنیا کے امتحانوں کے لیے کس قدر پریشان ہوتے ہیں کہ ان کی تیاری کے لیے اپنی تفریح بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ فیل ہونے کی ذلت کا سوچ کر خوف محسوس ہوتا ہے، لیکن سب سے بڑے امتحان کو ہم بالکل بھول جاتے ہیں۔ اس امتحان میں اگر ہم فیل ہو گئے تو آگ میں جلیں گے اور اگر پاس ہو گئے تو جنت میں رہیں گے۔ لیکن اس امتحان کی تیاری ہم بالکل نہیں کرتے۔ جب اذان ہوتی ہے تو ہم بہرے بن جاتے ہیں۔ چھوٹے امتحان کی فکر میں جان گھلا دیتے ہیں اور بڑے امتحان کو مذاق سمجھ کر بھول جاتے ہیں۔

آگے بھی کچھ لکھا تھا لیکن ہما کا ذہن کہیں اور پہنچ چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں تو میں فرسٹ آجاؤں گی، لیکن وہاں پہلے سوال کا جواب نہیں آتا ہو گا تو میرا کیا ہو گا؟

عصر کا وقت تھا۔ اذان کی آواز بھی آرہی تھی۔ ہما نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز ادا کرنے لگی۔ اس کی امی اس تبدیلی پر خوش بھی ہو رہی تھیں اور اپنے رب کا شکر بھی ادا کر رہی تھیں۔ ∎

بھلا دو

مرزا ظفر بیگ

احسان اور عبداللہ بہترین دوست تھے، لیکن دونوں آپس میں خوب لڑتے بھی تھے،اس کے باوجود ان کی دوستی کبھی ختم نہ ہو سکی۔ وہ دونوں ہر کام ساتھ کرتے تھے۔ روزگار کی تلاش میں ساتھ ہی جاتے تھے۔انہوں نے نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی تھی۔ گاؤں، دیہات، جنگل، پہاڑ غرض وہ ہر جگہ روزگار کی تلاش میں گئے۔ کبھی انہیں کامیابی ملی اور کبھی ناکامی، مگر اس دوران دونوں نے ایک دوسرے کا بھرپور ساتھ دیا۔

ایک بار وہ ایک ریگستانی علاقے میں پہنچے تو ان کے پاس بہت کم خوراک بچی تھی اور پانی بھی بہت کم تھا۔

احسان نے عبداللہ سے کہا:"اب ہم خطرناک علاقے میں ہیں۔ یہاں ہمیں دور دور تک نہ کوئی مدد مل سکے گی اور نہ ہی کھانا پینا۔ ایسا کرتے ہیں کہ ہم صرف آدھی خوراک کھائیں گے اور باقی آدھی حفاظت سے رکھ لیں گے اور چاہے کتنی بھوک لگے ،اس خوراک کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ لیکن جب ہمیں یہ محسوس ہو گا کہ اب ہمارے لیے ایک قدم آگے بڑھنا بھی مشکل ہو رہا ہے تو پھر ہم اس خوراک کو استعمال کر لیں گے۔ پانی کے ساتھ بھی ایسا ہی کریں گے۔"

احسان کی بات سن کر عبداللہ نے جواب دیا:"مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے اور پیاس بھی۔ مجھے کھانا اور پانی دونوں چاہیں۔"

اب تو ان کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا۔ عبداللہ کو فوری طور پر پانی کی ضرورت تھی، مگر احسان اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران عبداللہ کو غصہ آ گیا اور اس نے احسان کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ احسان نے جواب میں کچھ نہ کہا، بلکہ خوراک کی پوٹلی اور پانی کی بوتل عبداللہ کی طرف بڑھا دی۔ دونوں نے بے دلی سے تھوڑا بہت کھانا کھایا اور دو تین گھونٹ پانی پیا اور پھر خاموشی سے آگے کی طرف بڑھ گئے۔

اس موقع پر احسان نے ریت پر اپنی انگلی سے یہ الفاظ لکھے:

"میرے بہترین دوست نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔"

ان کا سفر جاری تھا۔ مگر اب نہ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور نہ لڑ جھگڑ رہے تھے، بلکہ خاموشی سے چلے جا رہے تھے ، یہاں تک کہ وہ ایک نخلستان میں پہنچ گئے۔ شدید گرمی میں خشک اور بے رحم ریت پر سفر کرتے ہوئے ان کی حالت بری ہو چکی تھی۔ نخلستان پہنچ کر عبداللہ بہت خوش ہوا۔ وہاں پانی کا ایک تالاب بھی تھا، عبداللہ نے ڈٹ کر پانی پیا اور جی بھر کر نہایا۔ اسی دوران عبداللہ نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا تو وہ تالاب کے پانی میں ڈوبنے لگا، مگر اسی لمحے احسان نے بھاگ کر اسے پکڑا اور اس طرح عبداللہ کی جان بچ گئی۔ عبداللہ نے احسان کو سینے سے لگایا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے نخلستان میں تھوڑا آرام کیا اور پھر روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو احسان نے قریبی چٹان پر اپنے چاقو کی نوک سے کچھ کندہ کاری کی۔ احسان نے وہ عبارت پڑھی، لکھا تھا:

"میرے بہترین دوست احسان نے میری جان بچائی ورنہ میں تالاب میں ڈوب جاتا۔"

احسان نے کہا:"تم نے جب میرے منہ پر تھپڑ مارا تو میں نے یہ بات ریت پر لکھی، تاکہ اس عبارت کو کچھ عرصے میں ہوا اڑا دے، لیکن یہاں میں نے تمہاری اچھائی کا ذکر چٹان پر چاقو کی نوک سے اس لیے کندہ کیا ہے، تاکہ یہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔ ہمیں اچھی باتیں سدا یاد رکھنی چاہئیں، لیکن بری باتوں کو ہمیشہ کے لیے بھلا دینا چاہیے۔"n

بجلی کی چوری

ثناء رحیم۔ چمکنی پشاور

"احمد! میں اپنے ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔" محمد نے جیسے اپنے دل کا حال احمد سے بیان کر دیا۔ احمد کئی روز سے محمد کی خاموشی کو محسوس کر رہا تھا۔ آج اس کے پوچھنے پر محمد نے اپنے دل کا حال بتا ہی دیا۔ احمد اور محمد ہم جماعت تھے اور دونوں اپنے وطن سے پیار کرتے تھے۔ احمد کے والد ایک سرکاری اسکول میں استاد تھے۔ وہ اپنا کام بہت ایمان داری سے کرتے تھے۔ وہ تنگی ترشی میں بھی اپنے بیٹے کو پڑھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہمت کر کے اپنے بیٹے کو شہر کے اعلیٰ اسکول میں داخل کروادیا تھا جہاں وہ بڑے لوگوں کے بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہیں اس کی دوستی محمد سے ہو گئی تھی۔ دونوں کا مقصد ایک تھا۔ دونوں ہی اپنے ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ آج جب احمد نے محمد کی باتیں سنیں تو اس نے کہا: "ہاں دوست! اب اس سطح پر تو ہم کوئی خاص کام نہیں کر سکتے۔ لیکن پڑھ لکھ کر، اپنے ملک کو صاف رکھ کر اور اس کی چیزوں کا خیال کر کے ہم کوئی نہ کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ جیسے آج کل بجلی چوروں کے خلاف کریک ڈاؤن ہو رہا ہے تو ہم بھی بجلی چوروں کو پکڑوا کر اپنے ملک کی مدد کر سکتے ہیں۔"

محمد، احمد کی بات سن کر سناٹے میں آگیا، کیوں کہ انہوں نے تو خود بھی کنڈے ڈالے ہوئے تھے اور اس کے باپ کی فیکٹری بھی چوری کی بجلی استعمال ہوتی تھی۔ انہوں نے میٹر ریڈر کو بھی ساتھ ملایا ہوا تھا۔ پھر محمد نے دل ہی دل میں سوچ لیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے باباجان سے بات کرے گا۔

رات کو کھانے کے بعد جب محمد نے اپنے باباجان سے اس بارے میں بات کی تو وہ ایک دم ناراض ہو گئے اور کہنے لگے: "یہ کام تو ساری دنیا کرتی ہے، اگر ہم نے کر لیا تو کیا ہوا؟ پھر یہ بتاؤ کہ تم میرے باپ ہو یا میں تمہارا؟"

"مگر باباجان! چوری تو حرام ہے، چاہے بجلی کی ہو یا کسی اور چیز کی۔" محمد نے آہستگی سے کہا۔

"تم یہاں سے جاؤ، میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔" ابو نے غصے سے کہا۔

ابو کی باتیں سن کر محمد بہت مایوس ہوا اور سر جھکا کر وہاں سے چپ چاپ چلا گیا۔ ابو نے اسے اس طرح جاتے دیکھا تو ان کے ضمیر نے انہیں ہلانا شروع کر دیا۔ جلد ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ سراسر غلط ہے۔ یہ لمحوں کا احساس تھا جس نے انہیں ایک دم بدل دیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بلوایا اور اس سے کہا کہ میں نے اپنے خدا سے توبہ کر لی ہے اور اب کوئی بھی کام ایسا نہیں کروں گا جس میں خدا کی ناراضی بھی ہو اور میری قوم اور ملک کا نقصان بھی۔ اب میں اپنے تمام کاروبار کو ہر طرح کی چوری سے پاک کر دوں گا۔"

یہ سن کر محمد بہت خوش ہوا اور اس نے "میرے ابو زندہ باد!" کا نعرہ بھی لگایا۔ کچھ ہی روز بعد ابو نے ہر طرح کے کنڈے ہٹوا دیے اور بجلی کی چوری ختم کر دی۔ n

اذہان کی فیس کیسے جمع ہوئی

عظیم ڈوگر (ملتان)

آج کلاس میں استاد نے طلبہ کو جگنو اور بلبل کی وہ مشہور کہانی سنائی جسے علامہ اقبالؒ نے نظم میں بیان کیا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک بلبل صبح اپنے گھونسلے سے معمول کے مطابق خالی پیٹ اڑا اور دانہ دنکا تلاش کر کے پیٹ بھرا۔ دوپہر کو ایک درخت کی شاخوں میں آرام کیا۔ اس کے بعد بلبل کو دوبارہ بھوک نے ستایا تو وہ پھر دانا دنکا ڈھونڈنے لگا، مگر کچھ نہ ملا۔

اسے چاہیے تھا کہ واپسی کی اڑان بھرتا، مگر اس سے سستی ہو گئی۔ اسی دوران تاریکی چھا گئی تو بلبل پریشان ہو گیا اور ایک درخت کی ٹہنی پر تنہا بیٹھ کر رونے لگا۔ اس کی آواز ایک جگنو نے سن لی اور اس کے دل میں بلبل کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چناں چہ جگنو نے بلبل کو تسلی دیتے ہوئے کہا: ”پریشان مت ہو، تمہارا گھر تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں۔“

یہ سن کر بلبل کو حوصلہ ملا، مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ رات کی تاریکی میں اپنے گھونسلے تک کیسے پہنچے گا۔ جگنو نے کہا: ”مجھے اللہ نے ایک خوبی عطا کی ہے۔ ذرا مجھے دیکھو!“ یہ کہہ کر جگنو نے پرواز کی۔ اس کے اڑنے سے فضا میں روشنی پیدا ہوئی۔ پھر اس نے بلبل سے کہا: ”دیکھ لی میری روشنی؟ اب میرے پیچھے آؤ، میں تمہارے آگے روشنی بکھیرتا چلوں گا۔ اس طرح تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔“

جگنو کی بات سن کر بلبل کی جان میں جان آئی۔ اس نے جگنو کے پیچھے اڑنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ اپنے گھونسلے تک پہنچ گیا۔ اس نے جگنو کا شکریہ ادا کیا اور کہا: ”یہ رات میرے گھونسلے میں میرے ساتھ گزار لو۔“

جگنو نے بلبل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ”میرے بھائی بند میرے انتظار میں ہوں گے، اس لیے چلتا ہوں۔“

بلبل نے ایک بار پھر جگنو کا شکریہ ادا کیا تو اس نے الوداعی سلام کرتے ہوئے کہا: ”بھائی بلبل! دنیا میں وہی لوگ اچھے اور نیک ہوتے ہیں جو دوسروں کے کام آئیں اور مشکل میں ان کی مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہی ہیں جو مخلوقِ خدا کے خادم ہیں۔ میں نے یہ کام کسی مزدوری یا اپنی تعریف کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے۔“ یہ کہہ کر جگنو فضا میں اڑتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر کچھ دیر تک اس کی روشنی نظر آتی رہی۔

کہانی ختم ہو گئی تو استاد نے بچوں کو دیکھا۔ سب گہری سوچ میں تھے۔ ایک طالب علم اذہان پریشان بیٹھا تھا۔ عام لڑکوں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا، مگر ہشام اس کے پاس آیا اور کہا: ”بھائی اذہان! کیا بات ہے؟ تم پریشان ہو؟“

اذہان نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا: ”ہشام بھائی! آپ کو معلوم ہے کہ دس تاریخ سے پہلے فیس جمع کرانی ہے ورنہ جرمانہ ہو گا اور شاید نام بھی خارج ہو جائے گا۔ میرے والد کو کئی ماہ سے مزدوری نہیں مل رہی۔ کبھی کبھار مزدوری مل جاتی ہے ورنہ اکثر خالی ہاتھ شام کو گھر واپس آجاتے ہیں۔ گھر کا کرایہ، بجلی پانی کے بل اور روزمرہ کی روکھی سوکھی روٹی بھی مشکل ہو گئی ہے، ایسے میں فیس کہاں سے لاؤں؟“

ہشام یہ سن کر پریشان ہوا، مگر پھر اس نے اذہان کو تسلی دیتے ہوئے کہا: ”بھائی! میں نے جب سے بلبل اور جگنو کی کہانی سنی ہے، میرے اندر ایک عجیب سی طاقت آگئی ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میرے والدین مجھے جو جیب خرچ روز دیتے ہیں، میں اس کا زیادہ حصہ جمع کرتا ہوں۔ تمہاری فیس ادا ہو جائے گی۔“

یہ سن کر اذہان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ہشام کی طرف دیکھا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ اگلے دن ہشام نے اپنے والد سے اپنی تین ماہ کی فیس لی اور اپنی جمع پونجی میں سے اذہان کی تین ماہ کی فیس کے برابر رقم نکال کر دوسری جیب میں ڈال لی۔ اگلے روز خاموشی سے اس نے اپنی فیس کے ساتھ اذہان کی فیس بھی اسکول میں جمع کرا دی۔ n

بس یوں ہی

سلمیٰ مراد۔ ڈیرہ غازی خان

آج میں نے زیادہ رش میں اچھی ڈرائیونگ کی تو ابو خوش ہو کر تعریف کرنے لگے اور کہا: ”تم کافی حد تک گاڑی چلانا سیکھ گئی ہو۔ بہت اچھی ڈرائیونگ کر لیتی ہو۔“ یہ سن کر میں بہت خوش ہوئی۔

اگلے دن شام کو جب ہم دونوں گاڑی سیکھنے نکلے تو نانی اماں کی طرف بھی چلے گئے اور انہیں ساتھ لے آئے، تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے مجھے گاڑی چلاتے ہوئے دیکھ لیں۔ ہم نے نانی اماں کو اپنے ساتھ لیا اور کالونی کا گیٹ عبور کر کے ایئرپورٹ کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئے۔ اب ابو کی ہدایات شروع ہوئیں:

”اسپیڈ کم کرو، اس ٹرک کو کراس کرو، اب کلچ چھوڑ دو، اور آہستہ کرو، گاڑی اپنی سائیڈ پر رکھو، نظریں سامنے سڑک پر رہیں۔“

ابو برابر راہ نمائی کر رہے تھے اور میں ان کی ہدایات کے مطابق گاڑی چلا رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ مکمل ہوا تو پھر واپسی کا سفر شروع ہوا۔

میں نے نانی اماں سے پوچھا: ”نانی اماں! سب ٹھیک رہا ناں؟ میں نے گاڑی کیسی چلائی؟“ میں نے ان سے داد وصول کرنے کی کوشش کی۔

یہ سن کر نانی اماں نے جواب دیا: ”ہاں، بس ٹھیک ہی چلائی ہے۔ ویسے بھی ابھی تو تم نے صرف اسٹیئرنگ پکڑنا سیکھا ہے۔“

میں نے معصومیت سے ابو کی طرف دیکھا تو ابو کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ رینگنے لگی۔

میں نے دل میں سوچا کہ آخر ابو نے مجھے ایک ہفتہ ٹریننگ دے کر کسی قابل سمجھا تبھی تو سڑک پر گاڑی چلانے کی اجازت دی ہے۔ مگر نانی اماں تو بس یوں ہی......

میری پہلی تحریر جب بچوں کے ایک رسالے میں شائع ہوئی تو میں خوشی سے پاگل ہو گئی۔ میں نے تمام گھر والوں، دوستوں اور رشتے داروں سب کو بتایا کہ میرا مضمون شائع ہوا ہے۔ پھر دوسرا شائع ہوا، تیسرا، چوتھا اور بہت سے شائع ہو گئے۔

ایک دن میری ایک سہیلی نے کہا: ”فضول کی بڑ نہ مارا کرو، تمہاری کہانی معمولی ہوتی ہے۔ جب ایڈیٹر کو چھاپنے کے لیے اور کچھ نہ ملے تو تمہارا مضمون چھاپ دیتے ہیں۔ جس ہفتے رسالے میں تمہارا مضمون شائع ہو تو سمجھ لو کہ ایڈیٹر چھٹی پر تھے اور رسالہ کسی اور نے تیار کیا ہے۔“

ایسی بہت سی باتیں سن کر میں سوچتی ہوں کہ آخر ایڈیٹر نے میری تحریر کو کسی قابل سمجھا ہے تو شائع کیا ہے ناں، ورنہ یہ لوگ تو بس یوں ہی باتیں بناتے ہیں۔

آج سارا دن میں مصروف رہی۔ پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ ٹیوشن پڑھنے گئی تو باجی نے ٹیسٹ دے دیا۔ میں نے بہانہ بنا کر اس سے بچنا چاہا تو باجی نے غصے سے کہا: ”تمہیں تو پڑھنے کا شوق ہی نہیں ہے۔ نالائقوں کی نانی ہو تم!“

”نہیں باجی! سچ مچ مجھے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہے، مگر پڑھتی نہیں ہوں، یہ اور بات ہے۔ اگر یاد کرنے بیٹھوں تو سب یاد ہو جاتا ہے، لیکن....“

”لیکن اس لیے نہیں پڑھتی کہ کہیں یاد نہ ہو جائے۔ ہے نا؟“ باجی نے میری بات کاٹ کر کہا تو میں سوچنے لگی کہ میں نے کتنے افسانے اور ناول تو پڑھ رکھے ہیں، اور یاد بھی ہیں، بے شک کوئی سن لے مجھ سے! یہ باجی بھی بس یوں ہی!

ہر انسان ایک دن میں گیارہ موڈ بدلتا ہے۔ میرے گیارہ موڈوں میں سے نجانے اس وقت کون سا موڈ ہے جو کچھ لکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ لیکن یہ موڈ میں نے خود نہیں بدلہ، بلکہ خود بخود بدل گیا ہے۔ ذہن میں بہت سی باتیں پھیلی ہیں، شاید اسی لیے لکھنے کا موڈ بن گیا، لیکن ایسا کوئی عنوان ذہن میں نہیں آ رہا جس کے تحت کچھ لکھ سکوں اور لکھنے کے لیے کوئی عنوان، کوئی خاکہ تو چاہیے ہوتا ہے ناں۔ میرے خیال میں مجھے عنوان کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ جب تک میں عنوان سوچوں گی اور کوئی خاکہ تیار کروں گی تب تک دوسرا موڈ بن چکا ہو گا۔

ویسے بھی عنوان کا کیا ہے، اصل بات تو مضمون کی ہوتی ہے، عنوان تو بس یوں ہی....n

چلے جاؤ یہاں سے

ثناء اکرم۔ کوٹ راجہ (سرگودھا)

دعا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے امی ابو نے اسے بہت محبت سے پالا تھا۔ وہ اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے، مگر اس لاڈ پیار نے بھی دعا کو مغرور نہیں بنایا تھا۔ وہ بہت حساس دل کی مالک تھی۔ اس کے اچھے اخلاق کی وجہ سے سب اسے بہت پسند کرتے تھے۔

آج دعا بہت خوش تھی، کیوں کہ آج اس کی سالگرہ تھی۔ اس نے اپنی سب سہیلیوں کو بھی بلایا تھا۔ سالگرہ کی تقریب میں کافی مہمان آئے اور دعا کے لیے تحفے بھی لائے۔ دعا ابھی مہمانوں سے مل رہی تھی کہ اسے باہر کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ گیٹ پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کی سہیلی کرن ایک بچے کو ڈانٹ رہی ہے اور بچہ بہت رو رہا ہے۔

"کیا بات ہے کرن؟ کیوں ڈانٹ رہی ہو اسے؟" دعا نے پوچھا۔

کرن برا سا منہ بناتے ہوئے بولی: "بہت بد تمیز ہے یہ، میں کب سے اسے جانے کا کہہ رہی ہوں، یہاں تم جیسے بچوں کی جگہ نہیں، مگر یہ سن ہی نہیں رہا، ڈھیٹ کہیں کا!"

دعا کو کرن کی بات بہت بری لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کرن سے کچھ کہتی، وہ بچہ روتے ہوئے بولا: "باجی! مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ آپ مجھے تھوڑا سا کھانا دے دیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ باجی!" بچے کی بات سن کر دعا کو بہت دکھ ہوا۔

اس نے بچے سے کہا: "چپ ہو جاؤ، اچھے بچے روتے نہیں۔ میں آپ کو کھانا دیتی ہوں، مگر یہ بتاؤ کہ آپ کے امی ابو کہاں ہیں اور آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"باجی! میرے ابو کا انتقال ہو چکا ہے اور میں اپنی امی کے ساتھ کچی بستی میں رہتا ہوں۔" بچے نے روتے ہوئے بتایا۔

اسی وقت کرن غصے سے بولی: "بند کرو یہ ڈرامے بازی، چلے جاؤ یہاں سے!" پھر وہ دعا کی طرف مڑی اور کہا: "اور تم اس پر کیوں مہربان ہو رہی ہو؟ اس کے کپڑے تو دیکھو، کتنے گندے ہیں۔ جانے دو اسے۔"

دعا سے مزید برداشت نہ ہوا تو وہ تیز لہجے میں بولی: "بس کرو کرن! یہ بچہ ہمارے دروازے پر آیا ہے، اور کسی کو خالی ہاتھ لوٹانا بہت خراب حرکت ہے جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ ویسے بھی اللہ نے تو سب انسانوں کو ایک جیسا بنایا ہے۔ یہ امیر اور غریب کے درجے تو ہم نے خود مقرر کیے ہیں۔ اور مجھے ایسے دوستوں کی ضرورت نہیں ہے جنھیں کسی کے دکھ اور تکلیف کا احساس نہ ہو۔ اگر تمھیں اس بچے کی موجودگی بری لگ رہی ہے تو تم جا سکتی ہو یہاں سے!" یہ کہہ کر دعا اس بچے کو ساتھ لے کر اندر آ گئی اور کرن پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔ n

چمگادڑ کی کہانی

ارم اکرم۔ لاہور

بہت پرانی کہانی ہے۔ایک روز جانور اور پرندے جنگل کا بادشاہ چننے کے لیے جنگل میں جمع ہوئے۔امیدواروں میں شیر اور چیل شامل تھے۔شیر کو اپنی طاقت پر بہت فخر تھا مگر چیل بھی کچھ کم نہ تھی۔وہ شیر کے مقابلے میں کھڑی ہوئی اور دعویٰ کیا کہ وہ شیر سے بہتر ہے۔اس بحث مباحثے میں جانوروں اور پرندوں میں بات بنتے بنتے بگڑ گئی اور ان دونوں گروہوں کے درمیان لڑائی شروع ہوئی جو جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔اس جنگ کے دوران چمگادڑوں کا رویہ بہت عجیب تھا، جب جانور فتح کے قریب ہوئے تو کوئی نہ کوئی چمگادڑ ان کے پاس چلی جاتی اور خود کو ان کا ساتھی ظاہر کراتی، کیوں کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے، لیکن جب پرندے جیتنے لگتے تو وہ پرندوں کے پاس چلی جاتی اور خود کو پرندہ ظاہر کراتی کیوں کہ وہ انڈے دیتی ہے۔پوری جنگ کے دوران وہ اسی طرح سے اپنے روپ بدلتی رہی اور آخر کار جانور یہ جنگ جیت گئے جس کے بعد چمگادڑ فوراً جانوروں کے پاس گئی اور انھیں ان کی فتح پر مبارک باد دی۔جب شیر جنگل کا بادشاہ بن گیا تو اس نے چمگادڑ سے کہا: ”تم ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتیں، کیوں کہ تم ایک پرندہ ہو اور انڈے دیتی ہو۔“ یہ سن کر چمگادڑ سیدھی پرندوں کے پاس پہنچی تو پرندوں نے اس سے کہا: ”تم جانور ہو، کیوں کہ تم اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہو۔“

یہ کہہ کر پرندوں نے بھی اسے اپنے گروہ سے نکال دیا۔اب نہ چمگادڑ جانوروں میں رہی اور نہ پرندوں میں۔اس وقت سے وہ اکیلی رہتی ہے۔اپنے آپ کو دن کی روشنی سے بچانے کے لیے اندھیری جگہ پر رہتی ہے اور رات کو اکیلی اڑتی ہے۔n

چھوٹا مزدور

وقاص اسلم

سردی کے موسم میں، میں نے اسے الجھے بالوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ چھوٹا سا لڑکا اس موسم میں کبھی نہیں نہاتا ہوگا، مگر میلے کچیلے کپڑوں میں بھی وہ شہزادہ لگتا تھا۔ وہ ایک مل میں کام کرتا تھا اور اپنے گھر سے بہت دور رہتا تھا۔ فیکٹری کے دوسرے مزدور اس کا خیال کرتے تھے۔ کام زیادہ تھا، اس لیے مزدور پچھلے چار ماہ سے چھٹی پر نہیں گئے تھے۔ نئے سال میں انہیں چار چھٹیاں ملنی تھیں جس پر وہ سب بہت خوش تھے اور چھوٹا مزدور تو زیادہ خوش تھا۔ مزدوروں نے فیکٹری کے مالک سیٹھ صاحب سے بچوں کے لیے تحفے لینے کی فرمائش بھی کی تھی جو انہوں نے قبول کرلی تھی۔ وہ بہت نیک اور سخی انسان تھے۔ انہوں نے ہامی بھرلی۔ چھٹی کے بعد سیٹھ صاحب نے سب مزدوروں کو اپنے آفس بلایا جہاں ان کے نام پکار کر انہیں گفٹ پیک دیے گئے۔

سبھی مزدور خوش تھے۔ پھر چھوٹے مزدور کا نام پکارا گیا تو وہ آگے بڑھا۔ سیٹھ صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر ایسا لگا جیسے انہیں کچھ یاد آگیا ہو۔

☆☆☆

کلاس میں بیٹھے نعیم کو بے چینی ہو رہی تھی۔ پھر گھنٹی بجی تو وہ کلاس سے باہر نکلا، آج اسے حمید سے نمٹنا تھا جس نے کل کلاس میں لڑائی ہونے پر نعیم کے ابو سے شکایت کی تھی۔ ادھر جیسے ہی حمید کلاس سے باہر نکلا تو اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ پڑا۔ وہ نعیم تھا جس نے حمید کو مارنا شروع کردیا تھا۔

بڑی مشکل سے لوگوں نے انہیں الگ کرایا۔ بات پرنسپل صاحب تک پہنچ گئی۔ تمام گواہ اور ثبوت حمید کے حق میں تھے، مگر نعیم پہلے ہی بدنام تھا، اسکول میں لڑائی جھگڑے کرنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ اسے کئی بار وارننگ دی گئی، لیکن وہ باز نہیں آیا۔ آخر پرنسپل صاحب نے اسے اسکول سے نکال دیا۔

پھر نعیم نے پڑھائی چھوڑ دی اور گلی محلے میں غنڈہ گردی شروع کردی۔ چھوٹی عمر میں ہی اس کی ذمے داریوں کا احساس دلانے کے لیے اس کی شادی بھی کردی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ چھوٹا مزدور سیٹھ صاحب کو جانا پہچانا سا لگا۔ انہوں نے اس سے والد کا نام پوچھا تو جواب سن کر چونک گئے۔ پھر اس سے کہا کہ مجھے اپنے باپ سے ملواؤ۔ دوسرے دن سیٹھ صاحب اپنی شان دار گاڑی میں چھوٹے مزدور کے ساتھ اس کے گھر پہنچے۔ اس کے والد کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ وہ نعیم تھا، سیٹھ صاحب کے بچپن کا کلاس فیلو! دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ نعیم نے انہیں اپنی دکھ بھری کہانی سناتے ہوئے کہا: ”اسکول سے نکل کر میں نے کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔ پھر میری شادی کردی گئی۔ میں نے بڑی سڑک پر چائے کا اسٹال لگا لیا تھا جس سے گزر بسر ہونے لگی۔ میرے پانچ بچے ہو چکے تھے، گزارہ مشکل ہو گیا تھا، پھر میں اکثر بیمار رہنے لگا تو اپنے اس بچے کو فیکٹری میں لگوادیا۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس فیکٹری کا مالک میرا ہی کلاس فیلو ہے۔ بہر حال اس کے آپ کی فیکٹری میں کام کرنے سے ہمارے حالات کچھ بہتر ہوئے اور دو وقت کی روٹی ملنے لگی۔“

یہ سن کر سیٹھ عبدالحمید کا دل دکھنے لگا۔ وہ اس فیملی کے برے حالات کا ذمے دار خود کو سمجھنے لگے، کیوں کہ نعیم کو ان کی وجہ سے اسکول سے نکالا گیا تھا۔ وہ آگے نہیں پڑھ سکا، اسی لیے ان حالات کو پہنچا۔ سیٹھ صاحب آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے نعیم کو گلے لگالیا۔ پھر انہوں نے نعیم کو اپنی فیکٹری میں ایک اچھی ملازمت دے دی اور اس کے بیٹے ”چھوٹے مزدور“ کی تعلیم کا بندوبست بھی کردیا۔ اب وہ ایک اچھے اسکول میں پڑھتا ہے۔

گویا نئے سال کی آمد کے ساتھ ہی اللہ پاک نے ان کے حالات بدل دیے۔ n

دانیال کی گھڑی

شاہ بہرام انصاری۔ ملتان

"حد ہوتی ہے دانیال بے پروائی کی! میں تمھیں کئی بار منع کر چکی ہوں کہ یہ کٹھ پتلیوں کا تماشہ دیکھنا بند کر دو مگر تم سنتے ہی نہیں۔" دانیال اور زین نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ امی نے غصہ شروع کر دیا۔

"امی جان! میں آپ سے کتنی دفعہ کہوں کہ یہی تو میرے آرام کے دن ہیں۔ بڑے ہو کر مجھے آپ کے کام ہی کرنے ہیں۔" دانیال نے گھسے پٹے جملے دہرائے۔

دانیال ایک کم عمر اور بے پروا لڑکا تھا۔ نصابی سرگرمیوں میں وہ جتنا ذہین تھا، دوسرے معاملات میں اتنا ہی کاہل اور سست تھا۔ بے پروائی اس کی گھٹی میں تھی۔ وہ اور زین باہر سے بندر کا تماشا دیکھ کر آ رہے تھے۔ زین سامنے ہی رہتا تھا۔ دونوں گہرے دوست تھے۔

دانیال میں یہ خرابی تھی کہ وہ جہاں کہیں کسی مداری کو دیکھتا، وہیں خود بھی جم جاتا۔ اس طرف زین نے راغب کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دانیال کی امی زین سے ناراض رہتی تھیں۔ مگر وہ بھی ڈھیٹ تھا، ہر وقت ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہتا۔

"دانیال بیٹا! کنزہ کو تو دیکھ کر آنا، مجھے سبزی منگوانی ہے۔"

امی نے صحن میں دھلے ہوئے کپڑے پھیلاتے ہوئے کہا۔ دانیال لاؤنج میں بیٹھا کارٹون دیکھنے میں مگن تھا، امی کا حکم سن کر منہ بسورنے لگا، لیکن پھر "جی اچھا امی" کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

وہ گیا تو اپنی چھوٹی بہن کنزہ کو دیکھنے تھا، مگر راستے میں زین مل گیا۔ اس نے دانیال کو بتایا کہ پچھلے بلاک میں ایک مداری بکری کا تماشا دکھا رہا ہے، اس کے پاس سانپ بھی ہے۔ دونوں تیزی سے اسی طرف بڑھ گئے۔ جب وہ بلاک میں پہنچے تو آس پاس کے بچے مداری کے گرد مجمع لگائے ہوئے تھے۔ مداری بچوں کا دل بہلا رہا تھا اور وقتاً فوقتاً ان سے پیسے بھی بٹور رہا تھا۔ دانیال کو اکتاہٹ محسوس ہوئی تو اس نے ٹائم دیکھنے کے لیے گھڑی پر نظر ڈالی، مگر گھڑی غائب تھی۔ ایک ہفتے پہلے اس کی سالگرہ پر اس کے ماموں نے اسے گھڑی کا تحفہ دیا تھا۔ اب تو وہ پریشان ہو گیا۔ وہ زین کو بتائے بغیر گھر کی طرف دوڑا تو ماموں جان اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس کی خالی کلائی دیکھ کر امی نے بھانپ لیا کہ وہ نئی گھڑی گم کر آیا ہے۔ اس کا پھولا ہوا سانس دیکھ کر ماموں نے پوچھا: "کیا ہو گیا؟"

مگر دانیال جواب نہ دے سکا، البتہ امی نے اس کی ماموں سے خوب شکایتیں کیں۔ ماموں کے سامنے اپنی بے عزتی پر وہ بہت شرمندہ تھا۔ اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر ماموں نے اپنی واسکٹ سے گھڑی نکالی تو دانیال کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ماموں نے کہا: "آپ کے گھر آتے ہوئے مجھے سڑک کے کونے میں یہ گھڑی گری ملی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ ضرور تمھاری ہو گی۔ تمھاری گھڑی کی تلاش نے تمھیں اپنی بے پروائی کی بری عادت سے نجات دلا دی ہو گی۔ اب یہ سمجھ لو کہ میری طرف سے یہ تمھارے لیے اسی سے چھٹکارا پانے کا انعام ہے۔"

ماموں کی بات سن کر سب ہنسنے لگے اور دانیال کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ n

دانتوں کا علاج کیسے ہوا؟

وقاص اسلم کمبوہ

اسکول کی اسمبلی میں کھڑا اسد بہت پریشان تھا۔ تھوڑی دیر بعد صفائی ستھرائی کی چیکنگ ہونے والی تھی۔ اسکول میں صاف ستھرے ہو کر نہ آنے والے بچے ایک طرف کھڑے کیے جا رہے تھے۔ پھر اس کا نمبر آ گیا۔ سر نے اسے چیک کرنے کے بعد کہا: ”تمہارے دانت صاف کیوں نہیں ہیں؟ کیا برش نہیں کرتے؟“ اس کے بعد سر نے اسے بھی ایک طرف کھڑا کر دیا۔

اسد چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا۔ اوسط درجے کے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ بہت محنتی لڑکا تھا۔ ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا تھا۔ اس کے ابو ایک فیکٹری میں ملازم تھے۔ پانچ بہن بھائی تھے۔ اچھی خاصی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ بچپن میں دانتوں کی صفائی کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے اس کے دانتوں میں کیڑا لگ گیا تھا۔ وہ جب بھی برش کرتا تو اس کے مسوڑھوں سے خون رستا اور تکلیف ہونے لگتی۔

اسکول سے واپسی پر اس نے امی کو بتایا کہ اس کو روز دانت صاف نہ کرنے پر سزا ملتی ہے۔

امی نے کہا: ”بیٹا! اس بار تمھارے ابو کو تنخواہ ملے گی تو تمہارے دانتوں کا چیک اپ کروائیں گے۔“

اگلے دن پھر چیکنگ ہوئی تو اس نے جلدی سے سر سے کہا: ”سر! میرے دانت خراب ہیں۔ برش کرتا ہوں تو مسوڑھوں سے خون آنے لگتا ہے۔ میرے ابو کی تنخواہ ملے گی تو ہم کسی ڈینٹسٹ سے چیک اپ کروالیں گے۔“

یہ سن کر سر نے اسد کو جانے کا اشارہ کیا۔ اگلے دن ابو کی تنخواہ مل گئی تو اسد اپنی امی کے ساتھ دانتوں کا معائنہ کروانے چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے دانتوں کا معائنہ کرنے کے بعد اس کو دوائیں اور ٹوتھ پیسٹ لکھ کر دیے اور پندرہ دن بعد بلایا۔

اسد نے باقاعدگی سے دوا بھی کھائی اور ٹوتھ پیسٹ کا استعمال بھی کیا، مگر وہ ٹھیک نہ ہوا تو اس نے ایک ایک کر کے دانتوں کے دو تین ڈاکٹروں کو دکھایا، مگر اس کے مسوڑھوں سے خون آنا بند نہ ہوا۔

☆☆☆

”جلدی کرو بیٹا! جمعے کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“ دادا جان نے اسد سے کہا جو نہانے جا رہا تھا۔

”ابھی آیا دادا جان!“ یہ کہہ کر اسد نہانے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ مسجد کے صحن میں موجود تھا۔

مولوی صاحب بیان فرما رہے تھے: ”صفائی اور پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔ جسمانی پاکیزگی کے ساتھ روح کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ دن میں پانچ وقت ہم وضو کرتے ہیں اور مسواک کرنا سنت ہے۔ یہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی پسندیدہ سنت ہے جو منہ کی صفائی کا بہترین عمل ہے۔ اس سے منہ کی بدبو جاتی رہتی ہے اور منہ میں خوشگوار تازگی آجاتی ہے۔ منہ کی تمام بیماریوں کا علاج مسواک میں پوشیدہ ہے۔ جدید تحقیق نے بھی منہ کی صحت کے لیے مسواک کی افادیت تسلیم کر لی ہے۔“

اسد مولوی صاحب کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس نے اسی وقت اپنے دل میں یہ عہد کیا کہ آئندہ پانچوں نمازوں کا اہتمام کرے گا اور مسواک کی سنت پر بھی عمل کرے گا۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ کچھ دن بعد اس کے دانت بالکل ٹھیک ہو گئے اور مسوڑھوں سے خون آنا بھی بند ہو گیا۔ اب وہ اسکول کی اسمبلی میں سب سے آگے کھڑا ہوتا ہے اور کسی سے شرمندہ نہیں ہوتا۔ n

دانتوں کی صفائی

مبشرہ خالد۔ کراچی

کھلے میدانوں اور پارکوں میں کھیلنے کودنے کا شوق آپ سب کو ہوگا اور آپ میں سے اکثر بچے اپنے شوق کی تسکین کے لیے قریبی پارکوں کا رخ کرتے ہوں گے۔ لیکن ذرا سوچیے کہ آپ کسی پارک میں کھیل رہے ہوں اور اچانک آپ کی ملاقات کسی ایسے دوست سے ہو جائے جس سے ملے ہوئے کافی دن ہو گئے ہوں تو یقیناً اس سے مل کر آپ خوش ہوں گے اور آپ کے چہرے پر ایک قدرتی مسکراہٹ دوڑ جائے گی۔ لیکن اگر آپ کا وہی دوست اچانک آپ سے یہ کہہ بیٹھے کہ تمہارے دانت اتنے پیلے کیوں ہو رہے ہیں؟ تم ٹھیک تو ہو؟ اس موقع پر یقینی طور پر آپ شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے۔

دانتوں کی صفائی صحت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلا کام دانتوں کی صفائی ہے، کیوں کہ اسکول میں حاضری دینی ہوتی ہے، اس لیے سبھی بچوں کا فرض ہے کہ وہ صبح دانت صاف کریں اور جو بچے اس معاملے میں سستی کا مظاہرہ کریں، ان کے امی ابو انہیں اس کی تاکید کریں، بلکہ اپنے سامنے ان سے دانت برش کرائیں۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ اکثر و بیشتر بچے رات کو سونے سے پہلے دانت صاف نہیں کرتے، انہیں نیند آرہی ہوتی ہے، اس لیے وہ اس چیز پر قطعی توجہ نہیں دیتے، ویسے بھی انھیں دانت صاف کرنا ایک مشکل مرحلہ محسوس ہوتا ہے۔ مگر اس کی وجہ سے ایک مشکل کھڑی ہو جاتی ہے اور دانتوں پر دن بھر کی کھائی ہوئی چیزوں کی پپڑی سی جم جاتی ہے، اگر رات کو سوتے وقت برش کیا جائے تو اس سے تحفظ ملتا ہے، کیوں اگر دانتوں پر میل یا پپڑی جم جائے تو اس سے کیڑا بھی لگ سکتا ہے جو دیگر تکالیف کو دعوت دیتا ہے۔ اس مشکل سے بچنے کے لیے اپنے دانتوں کی صفائی کا خاص خیال رکھیے، تاکہ آپ ہنستے مسکراتے رہے اور آپ کو ڈینٹسٹ کے پاس جاکر دانتوں میں انجکشن نہ لگوانے پڑیں۔ دانتوں کے درد اور تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، اور ساتھ ہی دوستوں کے سامنے شرمندگی بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ n

درویش بادشاہ کا راز

صاحب زادی عائشہ رحمٰن

ایک وقت تھا جب ملک کے حاکم اور بادشاہ عبادت گزار، پرہیز گار اور دینی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ایسے لوگ بڑے اعلیٰ کردار کے مالک ہوتے تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات ہوئی تو ان کی نماز جنازہ میں لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ دور دور سے لوگ ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا جو حد نگاہ تک نظر آتا تھا۔ جب جنازہ پڑھانے کا وقت آیا تو ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے کہا: ”میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا وکیل ہوں۔ حضرت نے میرے پاس اپنی ایک وصیت رکھوائی تھی جسے میں اس مجمع تک پہنچانا چاہتا ہوں۔“

یہ سن کر مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ وکیل نے کہا: ”حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ وصیت کی تھی کہ میرا جنازہ وہ شخص پڑھائے جس میں یہ چار خوبیاں ہوں:

☆ زندگی میں اس کی تکبیر اولیٰ کبھی قضا نہ ہوئی ہو۔

☆ اس کی تہجد کی نماز کبھی قضا نہ ہوئی ہو۔

☆ اس نے غیر محرم پر کبھی بری نظر نہ ڈالی ہو۔

☆ اتنا عبادت گزار ہو کہ اس نے عصر کی سنتیں بھی کبھی نہ چھوڑی ہوں۔

جس شخص میں یہ چار خوبیاں ہوں وہ میرا جنازہ پڑھائے۔“

یہ سن کر مجمع کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ کافی دیر گزر گئی، کوئی نہ آگے بڑھا۔ آخر کار ایک شخص روتے ہوئے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے جنازے کے قریب آئے۔ انہوں نے میت سے چادر اٹھائی اور کہا: ”حضرت! آپ خود تو رحلت کر گئے، مگر جاتے جاتے میرا راز فاش کر گئے۔“

اس کے بعد بھرے مجمع کے سامنے اس شخص نے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر کہا: ”میرے اندر یہ چاروں خوبیاں موجود ہیں۔“ چناں چہ انہوں نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کون تھے؟ وہ اس وقت کے بادشاہ سلطان شمس الدین التمش تھے۔n

دھرتی ماں کی فریاد

حمیدہ نسیم۔ کراچی

ننھے منے فرشتو! میرا دکھ میری فریاد انسانوں تک پہنچادو۔ ان سے کہہ دو کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہیں کھانے کے لیے طرح طرح کے پھل اور اناج دیتی ہوں۔ تمہیں گیس اور پیٹرول بھی دیتی ہوں، تاکہ تمہارے چولہے جلتے رہیں اور تمہاری گاڑیاں بھی چلتی رہیں۔ انسانوں سے کہو کہ تمہاری ماں کی صرف ایک گزارش ہے کہ نہ تو میرے منہ پر تھوکو اور نہ ہی اپنے گھروں کی گندگی میرے سینے پر پھینکو۔ مجھے آگ نہ لگاؤ اور نہ مجھ پر خون بہاؤ۔ دنیا کے تمام انسانوں کو یہ بتادو کہ اپنی ماں کے سینے پر خون بہانے والوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ تم نے جس طرح مجھ پر چلنے والے پھولوں کو خون میں نہلایا ہے، اس پر میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم نے بے گناہ فرشتوں کو موت کی نیند سلادیا، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم انسان نہیں، شیطان ہو۔ انہیں بتادو کہ جس دن میں اپنی جگہ سے ہل گئی، اس دن ان سب کو پیس کر رکھ دوں گی۔ میں اتنے سارے بچوں کا خون معاف نہیں کروں گی۔ انسانوں سے کہہ دو کہ میرے اوپر دیے نہ جلائیں، بلکہ کچرے میں سے اپنا رزق تلاش کرنے والے فرشتوں کو کھانا کھلائیں۔ ان معصوم فرشتوں کی روحوں کو خوش کرو جو ہم سے بچھڑ چکے ہیں۔ n

دل کا بوجھ

شائستہ انجم۔ واہ کینٹ

سائرہ نئی کلاس میں آکر بے حد خوش تھی۔ نیا سال اگلی کلاس اور کچھ نئی سہیلیاں، سب سے قریبی سہیلی مریم تھی جو اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ ایک کم گو سنجیدہ اور ذہین لڑکی تھی۔

مریم سائرہ کی ریاضی کے مضمون میں اور سائرہ انگریزی کے مضمون میں اس کی مدد کرتی اور دونوں وقفے میں لنچ بھی ساتھ ہی کرتیں۔

کچھ دنوں سے ایسا ہو رہا تھا کہ سائرہ کی امی بیمار چل رہی تھیں جس کی وجہ سے وہ اسے صبح لنچ نہ دے پاتیں، مگر اسے روزانہ جیب خرچ ملتا تھا۔ مریم یہ کرتی کہ سائرہ کو اسکول کے کینٹین سے کچھ نہ خریدنے دیتی بلکہ اپنا لنچ کھانے پر اصرار کرتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ مریم روزانہ بہت سادہ مگر بے حد لذیذ لنچ لاتی جسے سائرہ بھی بہت شوق سے کھاتی تھی۔

آج مریم اسکول سے غیر حاضر تھی۔ کچھ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ اسکول کیوں نہیں آئی۔ وقفے میں سائرہ نے اپنے بیگ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، تاکہ اسکول کینٹین سے کچھ کھانے کو خرید سکے۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ جیب بالکل خالی تھی جب کہ بہت سے دن کا جیب خرچ، خرچ نہ ہونے کی صورت میں جیب میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ سائرہ کے دل میں اچانک بدگمانی اور شک کی لہر آئی۔ کیا اس کا خرچ نہ ہونے والا جیب خرچ مریم نے لیا ہے؟ مگر پھر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

اگلے روز چھٹی تھی۔ امی نے سائرہ سے کہا: ”بیٹے! اسکول بیگ خالی کرو، بہت گندا ہو رہا ہے، میں دھو دیتی ہوں۔“

سائرہ نے اسکول بیگ الٹ دیا۔ تمام کتابیں، کاپیاں، قلم وغیرہ نکال دیے اور پھر آخر میں ایک بار پھر بیگ کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا کہ کچھ رہ تو نہیں گیا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، اس کے ہاتھ میں پچھلے بہت سے دنوں کا جیب خرچ تھا جو جیب کے اندر کا استر پھٹ جانے کی صورت میں بیگ کے اندر ہی رہ گیا تھا اور اب یہ خاصی رقم بن گئی تھی۔ اب سائرہ کو اپنی وہ بدگمانی یاد آئی جو اس نے مریم کے بارے میں سوچی تھی۔

اسے بہت افسوس ہوا۔ وہ تو شکر ہوا کہ اس نے کسی اور سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا، بہر حال اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں مریم سے ضرور بات کرے گی اور اپنی بدگمانی کی معافی مانگے گی۔

اگلے دن مریم اسکول یونیفارم میں نہیں تھی۔ سائرہ نے اس کی وجہ پوچھی تو مریم نے بتایا: ”میرے ابو ایک حادثے میں زخمی ہو گئے تھے اور کئی روز سے کام پر نہیں جا سکے۔ ہمارے معاشی حالات ایک دم خراب ہو گئے ہیں۔ میں فیس بھی جمع نہیں کرا سکی، ممکن ہے مجھے کچھ عرصے کے لیے پڑھائی چھوڑنی پڑے۔“

مریم کی بات سن کر سائرہ نے نہایت خلوص سے کہا: ”فکر مت کرو مریم، خدا پر بھروسا رکھو، تمہارے ابو جلد ٹھیک ہو جائیں گے اور تمہارے معاشی حالات بھی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے اسکول بیگ سے نکلنے والی رقم نکال کر مریم کو دے دی۔

مریم نے رقم لینے میں پس و پیش سے کام لیا، مگر سائرہ نہ مانی، آخر اس کے بے حد اصرار پر مریم نے واپسی کے وعدے پر وہ رقم لے لی اور سائرہ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مشکل وقت میں سچے دوست کی طرح مدد کی۔ دوسری جانب سائرہ بھی مریم کی بے حد مشکور تھی کہ اس نے اس کی مدد قبول کر کے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔n

دوستی کا حق

معظمہ تحسین۔ جڑانوالہ و فیصل آباد

زید اور عمر دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ان کی دوستی پورے اسکول میں مشہور تھی۔دونوں کلاس میں بھی ہمیشہ اکھٹے بیٹھتے تھے۔ سر حامد کو اس اسکول میں دو سال ہو گئے تھے، انھوں نے اس دوران ان دونوں کو اکھٹے دیکھا تھا۔ ایک دن سر حامد کلاس میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ زید اپنے دوست عمر کے بجائے عثمان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ وقفے میں بھی دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ گھومتے دیکھا تو سر حامد سے رہا نہ گیا اور انھوں نے دونوں کو چھٹی کے بعد لائبریری میں بلا لیا۔

زید لائبریری میں پہنچا تو عمر کو وہاں دیکھ کر غصے سے سرخ ہو گیا۔ سر نے ان دونوں سے کہا: ”میں کل سے دیکھ رہا ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو۔اس کی کیا وجہ ہے؟“

پہلے عمر بولا: ”سر! میرے ابو جان سرکاری محکمے میں ایک کلرک ہیں اور بہت ایمان دار ہیں۔ زید کے ابو میرے ابو کے دوست ہیں اور وہ انھیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ پرسوں چھٹی کے وقت گھر جاتے ہوئے میری ایک لڑکے سے لڑائی ہو گئی۔اس نے مجھے کہا کہ تمہارے ابو رشوت خور اور بے ایمان ہیں۔ میں نے زید کی طرف اشارہ کیا کہ بے شک تم زید سے پوچھ لو، میرے ابو جان ایسے نہیں ہیں۔ لیکن مجھے اس وقت حیرت کا جھٹکا لگا جب میرے عزیز دوست نے کہا، ہاں عمر ہو سکتا ہے انکل ایسے ہوں۔ بس پھر کیا میں نے اس سے دوستی ختم کر دی۔“

سر نے یہ واقعہ سنا تو افسوس بھری نگاہوں سے زید کی طرف دیکھا۔اس کے بعد زید بولا: ”سر! کیا میں اپنے دفاع میں کچھ کہوں؟“

سر حامد بولے: ”ہاں ضرور!“

یہ سن کر زید نے کہا: ”سر! آپ جانتے ہیں کہ غیر مسلم کس طرح مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ہم سب گھر والوں نے ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ میں نے عمر کو بھی ایک مسلمان ہونے کے ناطے اپنے مظلوم مسلمان بھائیوں سے اظہار یکجہتی کی خاطر ایسا کرنے کو کہا تو اس نے مجھے الٹا سا جواب دے دیا۔ میں نے اسے سبق سکھانے کے لیے یہ سب کچھ کہا حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ انکل واقعی ایک ایمان دار انسان ہیں۔“

عمر نے جب یہ سب سنا تو اسے بہت شرمندگی ہوئی۔اس نے زید کو گلے لگا لیا۔دونوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

سر یہ ساری کہانی سن کر حیرت سے زید کی طرف دیکھتے رہے اور اس کے جذبے کو سراہا۔پھر وہ بولے: ”زید بیٹا آج تم نے عمر سے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔“ ■

دوستی کی خواہش

عینا ممتاز، عائشہ ہما شاہ۔ کوٹ مومن

ہمارے اسکول کا ماحول بہت اچھا ہے۔یہاں لڑکیوں کی دوستیوں کا چرچا عام ہے۔ان میں ہرین اور وریشے کی دوستی کی تو مثالیں دی جاتی ہیں۔وہ دونوں اتنی اچھی سہیلیاں ہیں کہ ان کی بچپن تک کی باتیں ایک دوسرے سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ایک اور بات بھی ان کی پورے اسکول میں مشہور تھی،وہ یہ تھی کہ ان کی ناراضی ایک گھنٹے یا ایک دن سے زیادہ نہیں رہتی تھی۔

ان کی ایک اور کلاس فیلو بریرہ ان کی دوستی خراب کرنا چاہتی تھی۔بریرہ ویسے تو بہت خوب صورت تھی لیکن ،وہ دل کی اتنی ہی بد صورت واقع ہوئی تھی۔ حسد اس کی سب سے بڑی بیماری تھی۔وہ سمجھتی تھی کہ خوب صورتی ہی سب سے بڑی چیز ہوتی ہے۔وہ ہرین سے دوستی کرنا چاہتی تھی، مگر اس کی اچھی سہیلی وریشے کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اس سے حسد کرتی تھی۔بریرہ اکثر دل میں ایسی ترکیبیں سوچتی تھی کہ کسی طرح وریشے اور ہرین کی دوستی ختم ہو جائے۔

ایک روز بریرہ نے یہ گری ہوئی حرکت کی کہ کلاس کی ایک لڑکی کے پیسے چرا لیے اور اس کا الزام وریشے پر لگا دیا، تاکہ اس چوری کی سزا وریشے کو ملے۔اس نے کہا تھا کہ میں نے وریشے کے ہاتھ میں پیسے دیکھے ہیں۔سب لڑکیوں کو پتا تھا کہ وریشے ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتی، اس لیے کسی نے بریرہ کی بات پر یقین نہیں کیا۔جب یہ بات ان کی کلاس کی ٹیچر کو معلوم ہوئی تو انھوں نے سب کے بیگ چیک کرنے کو کہا۔سب کے بیگ چیک ہوئے تو وہ پیسے بریرہ کے بیگ سے نکلے جس پر ٹیچر نے بریرہ کو سزا دی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہرین، بریرہ سے نفرت کرنے لگی اور اس کے دل میں وریشے کا احترام اور بھی بڑھ گیا۔دوسری جانب بریرہ کو بہت شرمندگی ہوئی، اس نے آئندہ ایسا کام کرنے سے توبہ کر لی اور ہرین کے ساتھ ساتھ وریشے سے بھی دوستی کر لی۔n

فرحان کا تحفہ

نرگس عامر۔ کورنگی

فرحان بہت شرارتی تھا۔ شاید اسی لیے اسے بہت ڈانٹ پڑتی تھی، مگر پھر بھی اس کی شرارتوں میں کمی نہ آتی۔ حالاں کہ وہ خود بھی کوئی شرارت نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن پھر بھی اس سے کوئی نہ کوئی کام بگڑ جاتا۔ وہ اب بڑا ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اچھے کام کرے تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں۔

ایک روز فرحان گھر میں اکیلا تھا۔ دادا جان اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ اس کی امی اور آپی مارکیٹ گئی تھیں۔ فرحان نے سوچ لیا تھا کہ وہ کوئی شرارت نہیں کرے گا۔ وہ اپنا ہوم ورک کرنے بیٹھا۔ یکایک اس نے سوچا کہ پہلے آرام کرلوں، یہ سوچ کر وہ لیٹا ہی تھا کہ اسے گھبراہٹ ہونے لگی اور وہ باہر آ گیا۔ آپی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ ان کے کمرے میں گیا تو اس کی نظر کتابوں کے شیلف پر پڑی جس میں بہت سی کتابیں رکھی تھیں۔ ایک کتاب فرحان نے اٹھائی جو بچوں کی کہانیوں کی کتاب تھی فرحان وہ کتاب دیکھ رہا تھا کہ گلی سے شور کی آوازیں آنے لگیں ۔اس نے بالکنی سے جھانک کر دیکھا تو کچھ بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ فرحان انہیں دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ کتنے خراب بچے ہیں جو اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔

بے دھیانی میں اس کے ہاتھ سے کہانیوں والی کتاب نیچے جا گری۔

لڑنے والے تمام بچے اس کتاب پر جھپٹے اور ان میں سے ایک بچہ کتاب چھین کر بھاگ گیا۔

فرحان کی تو جان ہی نکل گئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ پلک جھپکتے میں یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ اب وہ بہت پچھتایا کہ میں آپی کے کمرے میں آیا ہی کیوں۔ اب میں آپی کو کیا جواب دوں گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی امی اور آپی واپس آ گئیں۔ وہ دونوں بہت سی چیزیں لائی تھیں جنہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کی سالگرہ ہو۔ اچانک اسے یاد آیا کہ آج اسی کی سالگرہ ہے۔

آپی نے بتایا: "یہ ساری شاپنگ تمہاری سالگرہ کے لیے کی ہے اور میں تو تمہارے دوستوں کو انوائٹ بھی کر چکی ہوں۔ میں تمہارے لیے ایک بہت اچھا گفٹ لائی ہوں، تمہیں بہت پسند آئے گا، لیکن ابھی نہیں رات کو دوں گی جب تم کیک کاٹو گے۔"

فرحان سمجھ گیا کہ آپی میرے لیے وہی کتاب والا گفٹ لائی ہوں گی۔ اس نے آپی کو پوری بات بتادی۔ یہ سن کر پہلے تو آپی ناراض ہوئیں، لیکن پھر انھیں احساس ہوا کہ اس میں فرحان کا کوئی قصور نہیں تھا اور ویسے بھی آج اس کی سالگرہ تھی، اس لیے انھوں نے اسے معاف کر دیا اور اسے پیار سے سمجھایا: "ہر کام سوچ سمجھ کر کیا کرو۔ اگر اسی طرح گڑبڑ کرتے رہے تو بہت نقصان ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں ویسی ہی ایک اور کتاب لا دوں گی۔"

اپنی اس سالگرہ پر فرحان نے پکا عہد کیا کہ وہ آئندہ ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کرے گا کہ اس سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہو۔ n

فوراً بنادوں گا

عماد بیگ ۔ کراچی

ایک گاؤں میں راجو نام کا ایک لڑکا رہتا تھا جو بہت شرارتی تھا۔ گاؤں کے سبھی لوگ اس کی شرارتوں سے تنگ تھے ۔ کئی بار ان لوگوں نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا، مگر وہ دیکھنے میں اتنا معصوم اور بھولا بھالا لگتا تھا کہ سب کو اس پر رحم آجاتا تھا اور وہ اس کی شرارتوں پر ناراض ہونے کے بجائے مسکرا دیتے تھے۔

ایک روز راجو کو شرارت سوجھی تو وہ گاؤں کے حجام چاچا دینو کے پاس پہنچ گیا۔ چاچا دینو اس وقت اپنی دکان کی جھاڑ پونچھ کر رہے تھے۔ انہوں نے راجو کو دیکھا تو سمجھ گئے کہ کسی شرارت کے ارادے سے آیا ہوگا، مگر انہوں نے اسے ڈانٹنے کے بجائے سنجیدہ لہجے میں کہا: ''آؤ راجو! کیسے آنا ہوا؟''

راجو نے کسی بڑی عمر کے فرد کی طرح بڑی اکڑ سے جواب دیا: ''مجھے اپنی داڑھی بنوانی ہے۔''

یہ سن کر چاچا دینو دل ہی دل میں ہنسے، مگر وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ آج راجو کو سبق ضرور سکھائیں گے۔ چناں چہ انہوں نے راجو کو کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''بیٹھو، میں ابھی بناتا ہوں تمہاری داڑھی!''

راجو بڑی شان سے آگے بڑھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ چاچا دینو نے اس کے سینے پر ایک تولیہ پھیلایا، پھر شیو کرنے والا صابن اٹھا کر اس کے چہرے پر لگایا اور برش سے جھاگ بنانے لگے۔ کچھ ہی دیر میں راجو کا چہرہ صابن کے گاڑھے جھاگ سے بھر گیا۔ اس کے بعد دینو بابا ادھر ادھر گھومنے لگے اور کچھ گنگنانے لگے۔ راجو حیران تھا کہ دینو چاچا کو کیا ہو گیا ہے، وہ خواہ مخواہ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ جب اسے جھاگ سے الجھن ہونے لگی تو اس نے دینو چاچا سے کہا: ''چاچا! میری داڑھی کیوں نہیں بناتے؟ کس چیز کا انتظار ہے تمہیں؟''

دینو چاچا نے بڑے سکون سے جواب دیا: ''مجھے تمہاری داڑھی کے نکلنے کا انتظار ہے، جیسے ہی نکلے گی، میں فوراً بنادوں گا۔''n

گندا رومال

صفیہ لاریب۔ کلر سیداں

کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا جس کی ایک بیٹی سارہ اور ایک بیٹا فرحان تھا۔ فرحان آٹھویں کلاس میں اور سارہ ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ فرحان کی شرارتوں سے پورا گاؤں تنگ تھا۔ دونوں کے سالانہ امتحان ہونے والے تھے۔ سارہ دل لگا کر پڑھتی تھی، مگر فرحان سارا دن آوارہ گھومتا رہتا تھا۔

جب اس کے امتحان میں دو دن رہ گئے تو اسے فکر ہوئی۔ ایک روز فرحان اسکول سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک فقیر ملا جس کے جسم پر بہت گندا لباس تھا۔ وہ آواز لگا رہا تھا: ”جو مجھے کھانا اور پیسے دے گا، اسے ایک عجیب چیز دوں گا۔“

یہ سن کر فرحان بھاگ کر گھر پہنچا اور وہاں سے کھانا اور پیسے لے کر آیا۔ اس نے وہ سب فقیر کو دیتے ہوئے کہا: ”اب بتائیں کہ آپ مجھے کیا عجیب چیز دیں گے۔“

فقیر نے اپنی جیب سے ایک گندا سا رومال نکال کر فرحان کو دیتے ہوئے کہا: ”جب تمہیں کوئی پریشانی ہو تو یہ رومال اپنے سر پر باندھ لینا، تم غائب ہو جاؤ گے اور کسی کو دکھائی نہیں دو گے۔“

یہ کہہ کر فقیر تو چلا گیا، مگر فرحان بہت خوش ہوا۔ اس خوشی میں نے اس نے امتحان کی تیاری بھی نہ کی اور اگلے دن ایسے ہی اٹھ کر اسکول چلا گیا۔ جب پیپر شروع ہوا تو فرحان نے اپنی جیب سے ایک کتاب نکالی اور اس میں سے وہ گندا رومال نکال کر اپنے سر پر باندھ لیا۔ فرحان کو جیب سے کتاب نکالتے ہوئے استاد نے دیکھ لیا اور پھر اسے کمرۂ امتحان سے نکال دیا گیا۔ ادھر سارہ نے بہت محنت سے پیپر دیے اور وہ کامیاب ہو گئی۔ فرحان اپنی غلطی پر شرمندہ تھا۔ اگر وہ اس فقیر کے جادوئی رومال کے چکر میں نہ پڑتا اور محنت سے پڑھتا تو ضرور کامیاب ہو جاتا۔n

گھر کی مرغی

ریحانہ ظفر۔کراچی

فقیرا ایک بہت ہی غریب آدمی تھا۔وہ اس مشکل اور مہنگائی کے دور میں سخت محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتا تھا۔ان بے چاروں کو ویسے بھی زیادہ تر چٹنی روٹی یا دال روٹی پر ہی گذارہ ہوتا تھا،کبھی کبھار کوئی سبزی یا دال بھی پکوالی جاتی تو اس گھر والوں کے مزے آجاتے،اور رہی بات گوشت کی،تو فقیرا کے گھر میں گوشت صرف بقر عید پر ہی پکتا تھا جب کوئی اس کے گھر والوں پر رحم کھا کر قربانی کے گوشت کی چند بوٹیاں اسے بھی دے جاتا تھا۔اس طرح اس کے گھر والوں کو سال میں ایک آدھ بار گوشت نصیب ہوتا تھا۔اس گھر میں زیادہ تر روٹی پیاز کی چٹنی سے کھائی جاتی تھی۔ فقیرا کے بچوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ انہیں کھانے کو جو بھی مل جاتا تھا،وہ خدا کا شکر ادا کر کے کھا لیتے تھے،نہ کبھی منہ بناتے تھے اور نہ کھانے کی کسی چیز کو برا کہتے تھے۔اس طرح فقیرا کے گھر کی دال روٹی کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی۔

ایک بار فقیرا کا ایک شادی میں شرکت کرنے کے لیے اپنے دور کے رشتے داروں کے ہاں جانا ہوا۔ فقیرا اپنے بچوں کے ساتھ وہاں چلا تو گیا،مگر مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ میرے میزبان یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنے سب بال بچوں کے ساتھ ان کے ہاں آ گیا ہوں،اتنے لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کیسے ہوگا؟ حالاں کہ وہ ان لوگوں کے دعوت دینے پر وہاں گیا تھا۔ فقیرا غریب ضرور تھا،مگر اتنا خود دار تھا کہ بغیر دعوت کبھی کسی کے ہاں نہ جاتا تھا،چاہے اس کے بچے کتنے ہی بھوکے کیوں نہ ہوں۔

مگر فقیرا کے میزبانوں نے اسے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی اپنی کسی بات یا کام سے یہ ظاہر کیا کہ انہیں فقیرا کا بال بچوں سمیت آنا برا لگا ہے۔اس کے برعکس فقیرا کے میزبان بہت فراخ دل اور مہمان نواز تھے۔ان لوگوں کا گھر بھی بہت بڑا تھا جس میں کئی بڑے بڑے کمرے تھے۔انہوں نے فقیرا کے ساتھ دیگر مہمانوں کو بھی الگ الگ کمروں میں ٹھہرایا اور ان کی خوب خاطر تواضع کی،انہیں اچھا سے اچھا کھلایا،ان کے آرام اور آسائش کا بھی ہر طرح خیال رکھا۔

اس گھر میں مرغیوں کا ایک بہت بڑا ڈربا بھی تھا جس میں ڈھیروں مرغیاں پلی ہوئی تھیں،بلکہ اسے چھوٹا سا پولٹری فارم کہنا چاہیے۔ میزبان انہی مرغیوں سے روزانہ مرغیاں نکال نکال کر ذبح کرتے اور ان سے اپنے مہمانوں کے لیے کھانا تیار کرواتے۔اس طرح روز روز دعوتوں کا یہ سلسلہ چلتا رہتا اور فقیرا،اس کی فیملی کے لوگ اور آئے ہوئے دیگر مہمان خوب ڈٹ کر کھاتے اور چین کی بنسی بجاتے۔یہ لوگ روز کھانا کھانے کے بعد آپس میں گپ شپ بھی کرتے تھے اور اس شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بھی گھومتے پھرتے تھے۔

آج ان سب کو اپنے میزبان کے گھر ڈیرا ڈالے تین روز ہو چکے تھے،گویا آج ان کی مہمان نوازی کا تیسرا دن تھا۔

آج بھی کھانے میں مرغی کا بہت لذیذ قورمہ تیار کیا گیا تھا۔ جب کھانا دستر خوان پر چنا جا رہا تھا تو مہمان اپنے میزبانوں سے بہت متاثر نظر آرہے تھے اور کہہ رہے تھے:''واقعی ہمارے میزبان نہ صرف بہت دولت مند ہیں،بلکہ بہت بڑے دل کے بھی مالک ہیں۔ کوئی بھی انسان کتنا ہی مال دار کیوں نہ ہو،وہ روزانہ اپنے مہمانوں کی خدمت میں مرغ مسلم پیش نہیں کر سکتا۔ بھئی ہمیں یہاں آئے ہوئے تین روز ہو چکے ہیں۔ایک آدھ دن دال سبزی بھی پیش کی جا سکتی تھی، مگر مسلسل ہی مرغی چل رہی ہے۔ یہ کیا راز ہے؟ ظاہر ہے اس سے ہمارے میزبان کی فراخ دلی کا اظہار ہوتا ہے۔''

ایک مہمان کی بات سنتے ہی دوسرے مہمان نے کہا:''ارے بھیا!''گھر کی مرغی دال برابر'' ہمارے میزبان کون سی بازار سے مرغی خرید رہے ہیں،بلکہ انہوں نے تو گھر میں پلی ہوئی مرغی ذبح کر کے اپنی بچت ہی کی ہے۔ بازار سے سبزی ترکاری یا دال چاول خریدتے تو انہیں چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔''

اس وقت سے یہ محاورہ مشہور ہو گیا ہے۔ آج بھی اگر کوئی انسان اپنے جیسے کسی دوسرے انسان کے لیے اپنے دل کے دروازے کھول دیتا ہے تو بجائے اس کے کہ لوگ اس کی تعریف کریں، بعض لوگ اس پر الٹی تنقید کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ لیکن کرنیں دوست ایسا نہیں سمجھتے،وہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی انسان دوسرے انسان پر اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوئی نیکی کرے تو اس کو ماننا اور تسلیم کرنا چاہیے۔

گم شدہ نگینہ

عمارہ بتول۔ گوجر خان

کسی زمانے میں ایک ملک پر ایک طاقت ور اور دلیر بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ اپنی سلطنت کے کاموں اور لوگوں سے بہت مطمئن بھی تھا۔ ایک روز وہ نہ جانے کیوں بہت اداس دکھائی دیا تو اس کے وزیر نے جو بہت اچھا اور عقل مند انسان تھا، بادشاہ سے پوچھا: ''عالم پناہ! آپ اداس اور پریشان کیوں ہیں؟''

جواب میں بادشاہ نے وزیر کو ایک بیش قیمت نگینہ دیا اور اس سے یہ بھی کہا کہ اسے بڑی احتیاط سے اور سنبھال کر اپنے پاس رکھنا۔ وزیر نے بادشاہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ نگینہ لے لیا اور جھک کر سلام کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بادشاہ نے اپنے خاص جاسوس کو حکم دیا: ''وزیر کا پیچھا کرو اور وہ جگہ دیکھ کر آؤ جہاں وزیر نے ہمارا دیا ہوا نگینہ رکھا ہے۔''

جاسوس نے حکم کی تعمیل کی اور بادشاہ سلامت کو وہ جگہ بتادی جہاں وزیر نے وہ نگینہ رکھا تھا۔ اس نے وہ نگینہ اپنے ہی گھر میں چھپادیا تھا۔

کچھ روز بعد بادشاہ نے وزیر کے خاص نوکر کو حکم دیا کہ وہ نگینہ چوری کر لائے۔ نوکر نے وہ نگینہ لا کر بادشاہ کو دے دیا اور بادشاہ نے اسے دریا میں پھینک دیا۔ اگلی صبح اس نے وزیر سے کہا: ''وہ نگینہ کہاں ہے جو میں نے تمھیں دیا تھا؟''

وزیر نے جواب دیا: ''وہ میرے پاس محفوظ ہے۔''

بادشاہ نے حکم دیا کہ جاؤ اور وہ نگینہ لے کر آؤ، مجھے اس کی ضرورت ہے۔''

وزیر اپنے گھر گیا اور اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ نگینہ گم ہو چکا ہے۔ وزیر نے نگینے کی گم شدگی کے بارے میں بادشاہ کو بتایا اور اس سے تین دن کی مہلت مانگی کہ وہ ان تین دنوں میں نگینہ واپس لوٹا دے گا۔

بادشاہ نے کہا: ''اگر ان تین دن میں تم نے نگینہ واپس نہ کیا تو تمھیں اور تمھاری بیوی کو سخت سزا ملے گی۔''

بادشاہ کا حکم سن کر وزیر بھاری دل کے ساتھ محل سے اپنے گھر چلا گیا۔ اس نے گھر کے ہر کونے میں نگینہ تلاش کر لیا، لیکن وہ نہ ملا۔

وزیر نے اپنے دل میں سوچا کہ میرا کوئی ولی وارث تو ہے نہیں جس کے لیے میں جائیداد وغیرہ چھوڑوں۔ میری بیوی، میرے ساتھ ماردی جائے گی، اس لیے یہ تین دن خوشی کے ساتھ گزارتا ہوں۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ غرض اس نے اپنی بیوی کو بادشاہ کے فیصلے کے بارے میں بتایا تو وہ بولی: ''آؤ ہم آزادی کے ساتھ اپنی دولت خرچ کریں، کیوں کہ ہمیں مرنا تو ہے ہی، اس وقت کو دکھ میں کیوں گزاریں؟''

اس دن وزیر نے اپنے گھر میں جشن کا انتظام کیا۔ اس کے ہاں بہت سے مہمان آئے۔ موسیقی کی محفل بھی منعقد کی گئی۔ لیکن گھر آنے والے کسی بھی شخص کو خالی ہاتھ جانے کی اجازت نہ تھی۔ تحائف لانے والے تاجروں کو سونے کے سکے انعام میں ملے تو وہ بہت خوش ہوئے۔

وہ وزیر کی زندگی کی آخری صبح تھی جب ایک دیہاتی نے وزیر کو ایک مچھلی تحفے میں پیش کی۔ وزیر کو مچھلی کھانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا: ''آج تو دوپہر کے کھانے کے لیے مچھلی کا سالن تیار کرو، ممکن ہے ہم دوبارہ اس کا لطف اٹھانے کے لیے زندہ نہ رہیں۔''

باورچی خانے میں وزیر کی بیوی نے مچھلی دھوئی اور اس کے پیٹ کو چاک کیا تو وہی نگینہ باہر نکل کر گرا جو بادشاہ نے دریا میں پھینک دیا تھا۔ یہ دیکھ کر وزیر اور اس کی بیوی بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے نگینے کو خوشبو والے پانی سے دھویا۔ پھر وزیر نے وہ نگینہ لے جا کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نگینہ دیکھ کر بادشاہ بہت حیران ہوا اور اس نے وزیر سے اس کے بارے میں پوچھا تو وزیر نے سارا واقعہ بادشاہ کو بتادیا۔ اس کے بعد بادشاہ سب درباریوں اور وزیروں کے سامنے وزیر کی تعریف کی اور اسے بہت سے انعام واکرام سے نوازا۔ n

حادثہ ہو کر رہا

مبشرہ خالد۔ کراچی

گاڑی کے ٹائر چرچرائے، ڈرائیور نے اسے روکنے کی پوری کوشش کی، مگر کوئی فائدہ نہ ہو سکا، کیوں کہ حادثہ بہر حال رونما ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں "وہ" مر چکا تھا۔ اس کی ماں پہلے ہی محتاط تھی اور اسے کسی بھی صورت میں اس کے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، لیکن وہ بہت ضدی تھا، مسلسل ضد کر رہا تھا کہ اسے دوستوں کے ساتھ کھیلنا ہے۔ ماں نے لاکھ سمجھایا کہ آج کل سڑکوں پر ٹریفک بہت زیادہ ہوتا ہے۔ تم چار بہنوں کے اکلوتے بھائی ہو، اگر تمھیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہوگا؟ مگر وہ نہ مانا، اسے تو مسلسل یہی ضد سوار تھی کہ اسے کھیلنے کے لیے جانا ہے۔

وہ اکثر اپنی ماں سے یہ شکوہ کرتا تھا: "تم نے مجھے لڑکیوں کی طرح گھر پر بٹھایا ہوا ہے۔ میری عمر والے تو سڑکوں پر کھیلتے ہیں۔"

ایک روز اس کی ماں نے کہا: "تمھیں چانپ بہت پسند ہے، میں وہ منگواتی ہوں، جی بھر کر کھانا۔ اور ساتھ ہی تمھاری خالہ کو بلاتی ہوں۔ تمھیں ان کی بیٹی ڈولی اچھی لگتی ہے ناں، اس کے ساتھ کھیلنا۔"

یہ سن کر وہ تنک کر بولا: "مجھے ڈولی کے ساتھ نہیں کھیلنا۔ نہ مجھے چانپ اچھی لگتی ہے اور نہ ڈولی سے کوئی دل چسپی ہے، مجھے تو صرف اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے جانا ہے۔"

تھک ہار کر ماں نے اسے بڑے پیار کے ساتھ چمکارا، اپنے سینے سے لگایا، اسے ایک گلاس دودھ پلایا اور دل پر پتھر رکھ کر دوستوں کے ساتھ کھیلنے بھیج دیا۔ لیکن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اب وہ خون میں لت پت اس حال میں پڑا تھا کہ کوئی اسے اٹھانے کو بھی تیار نہیں تھا۔ اس کی ماں اب اسے کبھی ہنستا، کھیلتا، مسکراتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مانو بلی کا شہزادہ "بلا" مر چکا تھا۔ ■

حلیم کی توبہ

ثروت یعقوب۔ لاہور

حلیم اور لطیف گاؤں میں رہتے تھے۔ لطیف کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔وہ ہر کام وقت پر کرتا تھا،شاید اسی لیے کلاس میں فرسٹ آتا تھا۔اس کے دوست بھی پڑھائی میں بہت اچھے تھے۔ لیکن حلیم کو پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس کے دوست بھی اسی کی طرح بے پروا تھے۔اکثر اسکول سے غائب رہتے تھے،چناں چہ امتحان میں فیل ہوتے رہتے تھے۔ لطیف نے حلیم کو بہت سمجھایا کہ وہ اپنا وقت برباد نہ کرے،دل لگا کر پڑھے،اپنے ماں باپ کا خیال رکھے،ان کا کہا مانے،مگر حلیم پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔وہ گھر سے تو لطیف کے ساتھ اسکول کے لیے روانہ ہوتا تھا،مگر آدھے راستے میں اپنے دوستوں کے ساتھ باغ کی طرف نکل جاتا۔چڑیوں کو غلیل سے مارتا اور کچے پھل توڑتا تھا۔ چھٹی کے وقت بیگ اٹھا کر گھر آجاتا۔

ایک دن حلیم نے باغ میں ایک ٹہنی پر چڑیا کا گھونسلا دیکھا جس میں ننھے بچے تھے۔وہ جلدی سے درخت پر چڑھا اور گھونسلے سے بچے نکال لیے اتنے میں چڑیا دانہ دنکا لے کر آگئی۔جب اس نے گھونسلے میں دیکھا تو بچے نظر نہ آئے،پھر تو اس نے چوں چوں شروع کردی۔ایسا لگ رہا تھا کہ وہ فریاد کررہی ہے۔ حلیم کو پھر بھی اس پر ترس نہ آیا۔وہ چڑیا کا "تماشا" دیکھ کر خوش ہورہا تھا کہ درخت کی وہ شاخ ٹوٹ گئی،وہ سیدھا نیچے گرا اور زخمی ہوگیا۔اس کا سر تو بچ گیا تھا،مگر ٹانگ ٹوٹ گئی۔کئی ہفتوں تک وہ اسپتال میں رہا۔وہ اپنی شرارتوں پر بہت شرمندہ تھا۔اس نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اب کبھی شرارت نہیں کرے گا۔خیر اسپتال سے فارغ ہوکر جب حلیم گھر آیا تو اس نے سب سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ کسی پر ظلم نہیں کروں گا۔اب حلیم خوب محنت کرنے لگا ہے،امتحان میں بھی اچھے نمبر لیتا ہے،لیکن اب وہ لنگڑا کر چلتا ہے۔ n

ہمارے پیارے نبی ﷺ

مریم عارف۔ کراچی

نبی پاک ﷺ دنیا و کائنات کی سب سے عظیم ہستی ہیں۔ آپ ؐ کی سیرت مبارکہ بے شمار خصوصیات سے آراستہ ہے۔ آپ ؐ بچپن میں ہی یتیم ہوگئے تھے۔ پہلے اپنے دادا حضرت عبدالمطلب کی کفالت میں رہے، پھر ان کے وصال کے بعد اپنے چچا حضرت ابوطالب کی سرپرستی میں آئے، مگر یہاں بھی غربت آپ ؐ کے ساتھ رہی۔ پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ ؓ سے شادی ہوگئی اور چالیس سال کی عمر میں اس کائنات کے خالق نے آپ ؐ کو اپنا آخری نبی ؐ منتخب کرلیا اور نبوت کے منصب سے سرفراز کیا۔ اس اعلیٰ درجے پر فائز ہوتے ہی ہر طرف سے مخالفین اور دشمنوں نے آپ ؐ کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ قریبی عزیز بھی مخالف ہوگئے۔ لیکن ہر تکلیف اور مشکل برداشت کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم پر آپ ؐ نے دین کی خاطر اپنے عزیز وطن مکے کو خیر باد کہہ دیا اور مدینے کا رخ کیا۔ مدینے میں اللہ تعالیٰ نے اس منصب کی تکمیل کا سامان مہیا کیا جس کے لیے آپ ؐ کو بھیجا گیا تھا۔ اس کے بعد ہر طرف اللہ کی وحدانیت اور رسول کریم ؐ کی رسالت کا پیغام گونجنے لگا۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ میں شروع سے انکساری تھی۔ آپ ؐ اسلامی سلطنت کے بانی ہونے کے باوجود اپنے تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ اپنے کپڑے خود سی لیتے، اپنی جوتیاں خود گانٹھ لیتے، کسی خادم کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ مسجد نبوی ؐ کی تعمیر کے موقع پر آپ ؐ نے عام مزدوروں کی طرح اینٹیں اٹھائی تھیں۔ غزوۂ خندق کے موقع پر آپ ؐ نے خندق کھودنے میں سب لوگوں کا ساتھ دیا تھا۔ دنیا میں بڑے سے بڑے ملک کے کسی بھی سربراہ کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس نے ایسی سادہ زندگی گزاری ہو۔ آپ ؐ کی ذات سادگی کا اعلیٰ نمونہ تھی اور تمام مسلمانوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ ہمیں بھی یہی چاہیے کہ اپنی زندگی رسول کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزاریں اور نمود و نمائش سے دور رہیں جس کے بعد یہ دنیا جنت بن سکتی ہے۔ n

حلوہ پوری

سوہہ۔ فیصل آباد

"لو بچو! سنو کہانی۔" دادی اماں نے پان منہ میں رکھتے ہوئے کہا تو ہم بڑے غور سے انہیں دیکھنے لگے۔ دادی اماں نے کہانی سنانی شروع کی:

کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا جس کا نام حلوہ تھا۔ اس کی شادی پوری نام کی ایک لڑکی سے ہوئی۔ پوری کو کہانیاں سننے اور پہیلیاں بوجھنے کا بہت شوق تھا۔ حلوہ اسے طرح طرح کی کہانیاں سناتا تھا۔

ایک دفعہ وہ دونوں رات کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو پوری نے حلوے سے کہانی سنانے کی فرمائش کر دی۔

حلوے نے اسے جواب دیا: "کیا کروں، آج تو مجھے کوئی کہانی یاد نہیں آ رہی، آج چھوڑو، کل میں تمہیں کوئی اچھی سی کہانی سناؤں گا البتہ آج ایک دلچسپ پہیلی سناتا ہوں۔"

پوری نے کہا: "ٹھیک ہے، کوئی پہیلی ہی سنا دو۔"

حلوے نے کہا: "وہ چوہے کی طرح کودتا ہے" جب حلوے نے یہ بات کہی تو اتفاق سے اسی وقت ایک چور ان کے گھر میں گھس رہا تھا۔ اس نے یہ سنا تو دبک کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان کو میرے آنے کا پتا چل گیا، نہ جانے میرا اب کیا ہوگا؟

اتنے میں حلوے نے کہا: "وہ خرگوش کی طرح کان دبائے بیٹھا ہے۔" چور نے یہ سنتے ہی بھاگنے کی تیاری کی۔ ابھی اس نے ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ حلوے نے کہا: "وہ ہرن کی طرح چھلانگیں مارنے جا رہا ہے۔" یہ سنتے ہی چور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

اس کے بعد کہانی ختم ہو گئی اور پوری سو گئی۔

صبح اٹھ کر حلوے نے اپنی بیلوں کی جوڑی کو کھولا جن میں سے ایک کا نام چور تھا اور دوسرے کا سپاہی۔ ایک کتا بھی تھا جس کا نام "پالیا تھا" ان سب کو ساتھ لے کر حلوہ کھیتوں کی طرف چل دیا۔

دوسری جانب رات والا چور مسلسل حلوے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا کہ رات والا آدمی یقینی طور پر جادوگر تھا۔ ذرا چل کر اس سے ملاقات کی جائے۔ چناں چہ وہ حلوے کے گھر پہنچا تو پوری سمجھی کہ یہ آدمی حلوے کا رشتے دار ہوگا۔ اس لیے اس کی خاطر مدارات کی جائے۔ اس نے آنے والے سے پوچھا: "روٹی یہیں کھاؤ گے یا حلوے کے ساتھ؟"

حلوے کا نام سنتے ہی چور کے منہ میں پانی آ گیا، اس نے جھٹ سے کہا: "میں تو روٹی حلوے کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔"

یہ سن کر پوری نے دو چار روٹیاں ایک کپڑے میں باندھیں اور چور کو ساتھ لے کر حلوے کے پاس پہنچی۔ حلوے نے اپنی بیوی پوری کو ایک اجنبی کے ساتھ دیکھا تو سوچا کہ یہ آدمی پوری کا رشتے دار ہوگا۔ چناں چہ اس نے ہل چلانا بند کیا اور بیلوں اور کتے کو ساتھ لے کر پوری سے کہا: "روٹی گھر چل کر کھائیں گے۔"

پوری نے حلوے کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ سب روانہ ہو گئے۔ بیلوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے مالک کے گھر کے قریب پہنچتے ہیں تو جس کا جی جدھر چاہے چل دیتا ہے۔ جب وہ گھر پہنچے تو چور نامی بیل گھر میں چلا گیا اور دوسرے بیل سپاہی نے کھلیانوں کی طرف منہ کر لیا۔ یہ دیکھ کر حلوے نے پوری سے کہا: "تم چور کو پکڑ لو، میں سپاہی کو لے کر آتا ہوں۔"

چور نے جوں ہی یہ سنا تو دم دبا کر وہاں سے بھاگا۔ یہ دیکھ کر حلوہ بھی اپنے کتے کو لے کر اس کے پیچھے بھاگا اور زور سے کہنا شروع کر دیا: "روٹی کھا کر جانا، روٹی کھا کر جانا۔"

مگر چور بھاگتا رہا اور کھلیانوں میں جا کر چھپ گیا۔ حلوہ اس کو تلاش کرتا رہا۔ اتفاقاً چور جہاں چھپا ہوا تھا، وہاں پہنچ کر حلوہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کتے کو بلانے کے لیے زور زور سے آوازیں دینے لگا: "پالیا، پالیا، پالیا۔" یہ سنتے ہی چور باہر نکل آیا اور حلوے کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگنے لگا۔

"لو بچو، کہانی ختم ہو گئی۔ اب تم بھی جا کر سو جاؤ، کل تمہیں ایک اور مزے دار کہانی سناؤں گی۔" دادی اماں نے کہا تو سب بچے خوش ہو کر چلے گئے۔ n

حضرت امام حسینؓ

شبیر ابن عادل

ہجرت کے چوتھے سال اور شعبان المعظم کی تین تاریخ کو حضرت امام حسینؓ دنیا میں آئے۔ ولادت باسعادت کی خبر سن کر حضور اکرم ﷺ تشریف لائے اور نو مولود حسین کے کانوں میں اذان دی۔ پھر حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو عقیقہ کرنے اور بچے کے ہم وزن چاندی خیرات کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد نبی پاک ﷺ نے حسینؓ نام رکھا۔
آقائے دو جہاں ﷺ اپنے چہیتے نواسوں حسنؓ و حسینؓ سے غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ تقریباً روز ہی دونوں کو دیکھنے حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے۔ انہیں اپنے سینے پر بٹھاتے، کندھوں پر چڑھاتے اور مسلمانوں کو تاکید فرماتے تھے: "ان سے محبت رکھو۔"

کئی بار ایسا ہوا کہ رسول اکرم ﷺ نماز میں سجدے کی حالت میں ہوتے تو حضرت حسینؓ پشت مبارک پر چڑھ جاتے اور حضورؐ سجدہ طویل کر دیتے، جب حسینؓ اتر جاتے تو سجدے سے سر اٹھاتے۔

ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے کہ حسینؓ مسجد کے دروازے سے داخل ہوئے اور زمین پر گر گئے۔ حضورؐ نے اپنا خطبہ روکا، منبر سے اتر کر انہیں زمین سے اٹھایا اور پھر منبر پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد صحابہ کرام سے فرمایا: "دیکھو! یہ حسینؓ ہے، اسے خوب پہچان لو اور اس کی فضیلت یاد رکھو۔"

حضور اکرم ﷺ نے حضرت حسینؓ کے لیے یہ الفاظ بھی ادا فرمائے: "حسینؓ مجھ سے ہیں اور میں حسینؓ سے ہوں۔"

رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا: "حسنؓ اور حسینؓ نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ دونوں میرے گل دستے ہیں۔ اے اللہ: میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں۔ تو بھی ان کو محبوب رکھنا۔"

امام حسین سات برس کے تھے کہ آقائے دو جہاں ﷺ اس فانی دنیا سے پردہ فرما گئے۔ حضرت امام حسینؓ سے صحابہ کرام بھی بہت پیار کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور خلافت میں آپؓ آٹھ نو برس کے تھے۔ وہ حسینؓ سے بہت زیادہ محبت اور شفقت سے پیش آتے اور آپؓ کو اپنے کندھوں پر بٹھاتے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت امام حسینؓ کے لیے پانچ ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا، جب کہ غزوہ بدر میں شریک صحابہ کے بیٹوں کو دو ہزار ماہانہ ملتے تھے، اس سے حضرت حسینؓ سے حضرت عمرؓ کی محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت حسینؓ کی عبادت، زہد، سخاوت، اعلیٰ اخلاق کے سب ہی قائل تھے۔ آپؓ نے پیدل پچیس حج کیے۔ آپؓ کے دروازے پر مسافروں اور ضرورت مندوں کا سلسلہ برابر قائم رہتا اور کوئی سوالی خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا۔ راتوں کو روٹی اور کھجوریں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے جاتے اور غریب محتاج بیواؤں اور یتیم بچوں کو پہنچاتے تھے۔

حضرت حسینؓ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے: "جب کسی صاحبِ ضرورت نے تمہارے سامنے سوال کے لیے ہاتھ پھیلا دیا تو گویا اس نے اپنی عزت تمہارے ہاتھ بیچ ڈالی۔ اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو۔ کم سے کم اپنی ہی عزت نفس کا خیال کرو۔"

غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ آپؓ عزیزوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ آپؓ کے علم و فضل کے سب ہی قائل ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کو 10 محرم الحرام سن 61ھ کو کربلا میں شہید کر دیا گیا۔ آپؓ کے ہم راہ آپ کے دیگر اہل خانہ اور جاں نثار بھی شہید ہوئے۔ اللہ رب العزت آپؓ پر ہزاروں رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔n

ہوشیار کون؟

مرزا ظفر بیگ

گاؤں کے قریب واقع ایک جھونپڑی میں ایک لڑکا رہتا تھا جسے سب ''چھوٹے'' کہہ کر پکارتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ واقعی قدوقامت میں بہت چھوٹا تھا۔چھوٹے کے چار موٹے تازے بھائی تھے جو سب بہت طاقت ور اور لمبے چوڑے تھے۔وہ اکثر چھوٹے کو مارتے تھے اور جواب میں چھوٹے بے چارہ کچھ بھی نہیں کر پاتا تھا۔وہ اکثر مذاق میں اسے دھکے دیتے تو چھوٹا منہ کے بل مٹی میں گر کر زخمی ہو جاتا، جس پر وہ قہقہے لگاتے تھے۔

ایک روز چھوٹے نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بھائیوں کو ان کی حرکتوں پر سبق ضرور سکھائے گا۔کچھ سوچنے کے بعد وہ اپنے بھائیوں کے پاس گیا اور سینہ تان کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔پھر سخت لہجے میں ان سے کہا: ''اگر تم خود کو بہت بہادر اور ہوشیار سمجھتے ہو تو میرے ساتھ سامنے والے جنگل میں چلو۔''

یہ سن کر اس کے چاروں بھائیوں نے حیرت سے اسے دیکھا تو چھوٹا بولا: ''ڈر گئے ناں؟ مجھے معلوم تھا.........''

مگر ایک بھائی نے غصے سے اس کی بات کاٹی اور جنگل کی طرف دوڑا۔اب صورت حال یہ تھی کہ چھوٹے آگے تھا اور چاروں بھائی اس کے پیچھے، وہ سب دوڑتے رہے، یہاں تک کہ چھوٹا لکڑی کے ایک بڑے سے لٹھے کے پاس جا کر رک گیا تو اس کے چاروں بھائی بھی رک گئے۔چھوٹے نے ان سے کہا: ''کیا تم اتنے طاقت ور ہو کہ اس لٹھے کو پاؤڈر میں بدل دو؟''

''کیوں نہیں۔'' چاروں بھائیوں نے اکڑ کر جواب دیا۔یہ کہتے ہوئے پہلا بھائی لٹھے پر کودا اور مسلسل کودتا رہا، لیکن لٹھے کا کچھ نہ بگڑا۔اب دوسرے بھائی نے لٹھے کو اٹھایا اور زمین پر پٹخ دیا، لیکن لٹھا ٹس سے مس نہ ہوا۔اس کے بعد تیسرے بھائی کی باری آئی، اس نے لٹھے پر گھونسے برسانے شروع کیے، لیکن لٹھا جس شکل میں تھا، اسی میں رہا، پاؤڈر بننا تو دور کی بات ہے، اس میں ایک خراش تک نہ آئی۔پھر چوتھے بھائی نے اسے آرا مشین سے کاٹنا شروع کیا، لٹھے کے ٹکڑے تو ہو گئے، مگر اس کا پاؤڈر پھر بھی نہ بن سکا۔اب وہ چاروں تھک چکے تھے، انہیں غصہ بھی آ رہا تھا کہ چھوٹے نے انہیں نہ جانے کس مشکل میں ڈال دیا ہے۔

انہوں نے چھوٹے سے کہا: ''اگر تم اتنے ہی ہوشیار ہو تو اس لٹھے کا پاؤڈر بنا کر دکھاؤ۔''

''یہ تو دو منٹ کا کام ہے۔'' چھوٹے نے جواب دیا۔یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ماچس نکالا، اس میں سے ایک دیا سلائی نکال کر جلائی اور لٹھے کو دکھا دی، لٹھے نے آگ پکڑ لی اور وہ آہستہ آہستہ جلنے لگا۔کچھ ہی دیر بعد لٹھا غائب تھا اور اس کی جگہ زمین پر نرم سفید پاؤڈر (راکھ) زمین پر پڑا تھا۔چھوٹے نے فخر سے اپنے بھائیوں کی طرف دیکھا تو وہ چاروں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔اب سب سے بڑے بھائی نے کہا: ''چھوٹے! ہم طاقت ور ضرور ہیں، لیکن تم ہم سے زیادہ ہوشیار ہو، اب ہم تمہیں کبھی نہیں ستائیں گے۔''

''سچ؟'' چھوٹے نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو ان چاروں نے اقرار میں سر ہلا دیے۔n

اتنے کم نمبر؟

ہالہ ظفر (تحصیل کھاریاں)

"داؤد! تمہارا رزلٹ آگیا؟" کالج میں داؤد کے دوست نعمان عرف نومی نے پوچھا۔

"ہاں، زیادہ اچھے نمبر نہیں آئے۔ صرف 425 نمبر ملے ہیں۔" داؤد نے اداسی سے جواب دیا۔

"425 نمبر کم ہیں کیا؟" نومی نے کہا: "میرے تو 315 نمبر آئے ہیں اور میں بہت خوش ہوں۔ جلدی اٹھو اور آئس کریم کھلاؤ۔"

نومی نے ہنستے ہوئے داؤد کو ہنسانے کی کوشش کی، مگر داؤد کا منہ بنا رہا۔ وہ اتنا سنجیدہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ نومی نے خاموشی اختیار کر لی اور دونوں گھر کی طرف چل پڑے۔

"میں نے اتنی محنت کی تھی، پھر اتنے کم نمبر کیوں آئے؟" پورے راستے داؤد یہی سوچتا رہا: "کتنے طلبہ بغیر پڑھے اتنے اچھے نمبر لے لیتے ہیں، مگر میں نے تو محنت کی تھی، پھر ایسا کیوں ہوا؟"

گھر پہنچتے ہی داؤد نے بے دلی سے امی جان کو سلام کیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نہ مٹھو سے باتیں کیں اور نہ بلی کو پیار کیا، نہ امی سے کوئی مذاق کیا اور نہ چھوٹی بہن مریم سے کوئی شرارت کی۔ ان سب نے اس کی اداسی کو محسوس کیا۔

"امی! داؤد کو کیا ہوا ہے؟" مریم امی نے پریشانی کے عالم میں امی سے پوچھا۔

"تھک گیا ہوگا، آرام کرنے دو۔ پھر پوچھتی ہوں کیا ہوا ہے۔" امی نے جواب دیا۔

"آج کچھ اور بات ہے، جائیے پتا کریں۔" مریم اپنے بھائی کے لیے فکر مند تھی۔ اس کے کہنے پر امی داؤد کے کمرے میں گئیں تو وہ بستر پر لیٹا رو رہا تھا۔

"بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟ کیا ہوا ہے؟" امی نے اس کے پاس بیٹھ کر فکر مند لہجے میں پوچھا۔

جی امی، ٹھیک ہوں میں۔" داؤد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور جلدی سے آنسو پونچھے۔

"بیٹا! کیا ہوا ہے؟" امی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی جان! میرا رزلٹ آیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

"اچھا تو رزلٹ خراب آیا ہے اس میں رونے والی کون سی بات ہے؟ اٹھو، منہ دھوؤ، پھر بات کرتے ہیں۔ رزلٹ کی اتنی ٹینشن......" امی نے مسکراتے ہوئے کہا: "مگر یہ تو بتاؤ کہ نمبر کتنے آئے ہیں؟"

"550 میں سے 425 نمبر۔" داؤد نے جواب دیا۔

"یہ کم ہیں کیا؟ اللہ کا شکر ادا کرو بیٹا!" انھوں نے داؤد کو پیار کرتے ہوئے کہا: "اللہ تعالیٰ کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ چلو ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے لیے آجاؤ۔"

جب وہ کھانے کے لیے پہنچا تو مریم نے شوخ لہجے میں کہا: "بھیا! مبارک ہو، اتنا اچھا رزلٹ آیا اور کمرے میں چھپ گئے کہ بہن کو کچھ نہ دینا پڑے۔" امی ہنسنے لگیں، داؤد نے بھی مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ اس نے دو لقمے لیے اور کھانا چھوڑ دیا۔

"بھیا! کھانا کھائیں ناں!" مریم نے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ اٹھنے لگا تو امی نے کہا: "بیٹھ جاؤ، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔

امی نے کہا: "بیٹا! تمہارا رزلٹ کس حوالے سے برا ہے؟ کلاس میں پہلی پوزیشن اور نمبرز بھی اچھے بھلے، پھر یہ اداسی کیوں؟"

"مجھے اتنے کم نمبروں کی امید نہیں تھی۔" داؤد نے جواب دیا۔

"بیٹا! ہم کم محنت کر کے بہت زیادہ کی امید لگا لیتے ہیں، لیکن بہت سے بچے زیادہ محنت کر کے بھی کم نمبر پاتے ہیں ہم بیج ڈال کر سمجھتے ہیں کہ ہر بیج سے پودا نکلے گا۔ کچھ بیج خراب بھی تو ہوتے ہیں۔ شکر کرو کہ تمہاری محنت کے بیجوں کا رزلٹ وقت پر اور اچھا نکلا ہے۔"

امی کی باتوں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ وہ ہمیشہ ماں جی کی باتوں سے پر سکون ہو جاتا تھا۔

"مریم تمہارے رزلٹ کا کیا بنا؟" اچانک اسے یاد آیا تو اس نے بہن سے پوچھا۔

"فرسٹ پوزیشن لی ہے، 300 میں سے 250 نمبر لیے ہیں۔" مریم نے فخر سے کہا۔

"بھئی واہ! تم نے تو میدان مار لیا۔" اس نے مریم کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

رات کو امی داؤد کے کمرے میں گئیں تو داؤد آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ انہوں نے داؤد سے کہا: "میں جانتی ہوں کم نمبر آنے پر تم اداس ہو۔ تم نے جتنی محنت کی، اس کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ ہم دنیا میں ترقی کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں۔ اپنی مصروفیت میں اس ذات کو بھول جاتے ہیں جو ہمیں کامیاب یا ناکام کرتی ہے۔

میں دیکھ رہی ہوں کہ تم آج کل کتابوں میں گم ہو گئے ہو، نہ نماز پڑھتے ہو اور نہ اس سے دعا مانگتے ہو، نماز پڑھنی بھی تو جلدی میں۔ ہمیں سب سے پہلے خدا کو یاد رکھنا ہے۔ جب ہم آسان وقت میں اسے یاد رکھیں گے تو وہ مشکل وقت میں ہماری توقع سے بڑھ کر عطا کرے گا۔"

"جی امی!" داؤد نے سمجھ لیا تھا کہ اسے اب کیا کرنا ہے۔ اس نے مسکرا کر امی کو دیکھا اور انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔n

جدید ترین روبوٹ ECCI "ایسی"

فوزیہ سیمین مغل۔ مانانوالا، فیصل آباد

روبوٹ سازی کے شعبے میں حیران کن رفتار سے ترقی ہوئی ہے۔

روبوٹ سازی کی سائنس کو روبوٹکس کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی برق رفتار ترقی سے روبوٹکس کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے اور سائنس دانوں کے لیے پیچیدہ ترین روبوٹکس کی تخلیق بھی ممکن ہو گئی ہے۔ روبوٹ سازی کے آغاز سے لے کر ابتدائی چند عشروں تک ان مشینوں کا استعمال موٹر کاریں بنانے والے اداروں اور چند بڑی صنعتوں تک محدود ہے، لیکن روبوٹکس میں ہونے والی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کا استعمال بھی پھیلتا چلا گیا اور اب روبوٹ موٹر کاریں بنانے کے علاوہ گھریلو امور کی انجام دہی، بارودی سرنگوں کو ناکارہ بنانے، جاسوسی، آپریشن میں ڈاکٹروں کی معاونت، لوگوں کو تفریح کی فراہمی جیسے کام بھی سرانجام دے رہا ہے۔ جرمنی کی زیورخ یونی ورسٹی کے روبوٹکس ماہرین کا خواب ایسے انسان نما روبوٹ تیار کرنا ہے جن میں انسانوں کی طرح سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ ایسے روبوٹ بنائے جا چکے ہیں، مگر میں یہ صلاحیت محدود ہے۔ اس ضمن میں پچھلے دنوں اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ اسی یونی ورسٹی کے سائنس دانوں نے ایک روبوٹ تیار کیا تھا جسے دنیا کا سب سے جدید روبوٹ کہا جاتا ہے۔ اس میں اہم بات یہ ہے کہ اس روبوٹ میں اپنی غلطیوں کو دہرانے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ اس روبوٹ کو "ایسی" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی کھوپڑی میں حساس ترین پرزوں پر مشتمل دماغ نصب کیا گیا ہے۔ اپنے جوڑوں کو حرکت دینے کے لیے "ایسی" برقی موٹروں سے کام لیتا ہے۔ اس کا دماغ اس سے سرزد ہونے والی غلطی مثلاً کسی حرکت کے نتیجے میں لڑکھڑا جانا وغیرہ کا تجزیہ کرتا ہے۔ انسانوں کے برعکس "ایسی" کی صرف ایک آنکھ ہے، لیکن اپنی اس اکلوتی آنکھ سے یہ وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو انسان اپنی دو آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ یاد رہے کہ ایسی کی تخلیق تین برس کی مسلسل محنت کے بعد ممکن ہو سکی اور اس منصوبے پر تقریباً 50 لاکھ یورو لاگت آئی ہے۔n

جیب کترے

شاہ بہرام انصاری (ملتان)

فرحان اور شاہد کو ملازمت تلاش کرتے ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ دونوں نے ایم اے کرنے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ فرحان اپنے پانچ بہن بھائیوں اور شاہد سات بہن بھائیوں اور والدین کے ساتھ کچی آبادی میں رہتا تھا۔ دونوں نے نہ جانے کس طرح ایم اے کر لیا تھا ورنہ اس بستی میں مشکل سے کوئی مڈل یا میٹرک پاس تھا۔ فرحان اور شاہد اسکول کے زمانے سے ہی اچھے مستقبل کے خواب دیکھتے تھے۔ دونوں پڑھ لکھ کر جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہتے تھے۔ روزانہ دونوں ایک ساتھ صبح گھر سے نکلتے اور شام کو تھکے ہارے مایوس گھر لوٹتے تو وہ ماں باپ جو اچھی ملازمت کی خوش خبری سننے کو بے چین ہوتے، ان کے چہروں کو دیکھ کر اور بھی مایوس ہو جاتے۔ آج پورا ایک مہینہ ہو گیا تھا، مگر دونوں میں سے ایک کو بھی ملازمت نہیں ملی تھی۔ آخر جب وہ در در کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے تھک گئے تو ناچار شہر میں معمولی سیلز مین بن گئے۔ آج ان کی اس ملازمت کا پہلا دن تھا۔ وہ بس میں شہر جا رہے تھے۔ بس میں گنجائش سے کہیں زیادہ مسافر سوار تھے۔ یکایک فرحان کی نظر ایک شخص پر پڑی جو بڑی ہوشیاری سے اپنے ساتھ کھڑے مسافر کی جیب میں ہاتھ ڈال رہا تھا۔ وہ جیب کترا تھا۔ فرحان نے شاہد کی توجہ اس طرف مبذول کروائی۔ اس دوران جیب کترے نے بھی ان دونوں کو اپنی جانب تکتے دیکھ لیا تھا، وہ گھبرانے کے بجائے سینہ تان کر ان کے پاس پہنچا اور دھیمی آواز میں کہا: "دوست! زبان بند رکھنا، یہ لو ہزار روپے!"

اتنی رقم دیکھ کر دونوں کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر روپے لے لیے اور آنے والے اسٹاپ پر اترے تو جیب کترا بھی ساتھ ہی اتر گیا اور ان سے بولا: "میرے خیال میں تم بھی یہی کام شروع کر دو۔ بہت منافع ہو گا۔ نوکریوں میں کیا رکھا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"بات تو اس کی ٹھیک ہے۔" شاہد نے فرحان سے کہا۔

"ہاں، محنت مزدوری کرنے سے تو بہتر ہے کہ ہم یہی کام شروع کر دیں۔" فرحان نے جواب دیا۔

دونوں ملازمت پر جانے کے بجائے شہر میں خوب گھومے پھرے، کھایا پیا، ایک فلم بھی دیکھی اور ڈھیر ساری شاپنگ بھی کر لی۔ شام کو واپس گھر لوٹے تو باقی روپے اپنے اپنے والدین کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اتنے نوٹ دیکھ کر دونوں دوستوں کے گھر والوں کی آنکھیں چمک اٹھیں، انہوں نے کچھ بھی پوچھے بغیر وہ روپے لے لیے۔

اس کے بعد انہوں نے جیبیں کاٹنے کا "کاروبار" شروع کر دیا۔ وہ روزانہ مختلف بسوں اور ویگنوں میں ہاتھ کی صفائی دکھانے لگے اور اس ناجائز کمائی پر عیش کرنے لگے۔ ایک آدھ بار ان کے گھر والوں نے پوچھنے کی کوشش کی تو وہ ٹال گئے۔ غرض جلد ہی وہ دونوں ماہر جیب کترے بن گئے۔ ایک دن فرحان اور شاہد ایک امیر آدمی کی جیب پر ہاتھ صاف کرنے والے تھے کہ ایک پولیس انسپکٹر نے انہیں دیکھ لیا اور گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن اس طرح پکڑے جائیں گے۔ پولیس والوں نے ان کی خوب ٹھکائی کی اور گھر والوں نے بڑی مشکل سے ضمانت کرائی۔ دونوں دوستوں نے توبہ کر لی تھی کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔ ان کے پاس کچھ رقم تھی جس سے انہوں نے ایک چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا جس میں اللہ نے برکت ڈال دی۔ اب وہ دونوں حلال کی روزی کما رہے ہیں اور پرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں۔ n

جھوٹ سے توبہ

ثناء رحیم۔ چمکنی پشاور

دیا ایک لائق لڑکی تھی اور ہر جماعت میں بہترین پوزیشن لیتی تھی۔اس سے اس کی سبھی ٹیچر ز اور سہیلیاں بہت خوش تھیں، کیوں کہ وہ اچھا پڑھتی تھی، کلاس میں پوزیشن لیتی تھی اور ساتھ ساتھ اچھے اخلاق کی مالک بھی تھی۔ مگر اس میں صرف ایک عادت خراب تھی اور وہ یہ کہ دیا اکثر جھوٹ بولتی تھی۔ گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود بھی اس نے جھوٹ بولنا نہ چھوڑا۔

ایک بار یہ ہوا کہ دیا نے ایک ٹیسٹ دیا جو کہ کسی مقابلے میں شرکت کے لیے تھا۔ لیکن اس میں دیا کے نمبر کم آئے۔ جب اسکول میں اس کی سہیلیوں سے اس ناکامی کا سبب پوچھا تو اس نے شرمندگی سے بچنے کے لیے جھوٹ بول دیا: ”میرے ابو نے مجھے مقابلے میں شریک ہونے سے منع کر دیا تھا، ورنہ میں تو منتخب ہو گئی تھی۔“

یہ سن کر دیا کی سب سہیلیوں نے افسوس کا اظہار کیا اور اس کے ابو پر تنقید کی جنھوں نے اسے مقابلے میں حصہ لینے سے روک دیا تھا۔ جب دیا کی کلاس ٹیچر نے اس سے پوچھا تو بھی دیا نے کمال ڈھٹائی سے یہی جھوٹی کہانی انہیں بھی سنا دی۔

ٹیچر کو بھی افسوس ہوا کہ اس کے ابو نے ایسا کیوں کیا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ مقابلے میں ابھی کتنے دن باقی ہیں تو دیا نے بتایا کہ چند روز باقی ہیں۔ یہ سن کر ٹیچر نے دیا سے اس کے ابو کا فون نمبر مانگا تو اس نے سوچے سمجھے بغیر دے دیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ٹیچر اس کے ابو کو فون کریں گی۔

جب رات کو ابو گھر واپس آئے تو انہوں نے دیا کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس ٹیسٹ کے متعلق پوچھا تو دیا نے صاف صاف بتا دیا کہ میں اس میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

اصل کہانی یہ تھی کہ ٹیچر نے اس کے ابو سے فون پر بات کی تھی اور ان سے پوچھا تھا کہ انہوں نے اپنی بیٹی کو مقابلے میں حصہ لینے سے کیوں منع کیا۔

اب ابو نے دیا سے کہا: ”مگر تم نے تو اپنی ٹیچر سے یہ کہا ہے کہ تم اس ٹیسٹ میں پاس ہو گئی تھیں، مگر میں نے تمہیں منع کر دیا!“

یہ سن کر دیا بوکھلا گئی۔ پھر ابو نے اسے خوب ڈانٹ پلائی اور اسے بتایا کہ میں تمہاری ٹیچر کو ساری بات سچ سچ بتا دی ہے۔ دوسرے دن دیا نے اپنی کلاس ٹیچر اور اپنی سہیلیوں سے معافی مانگی اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گی۔n

جوتے کہاں سے آئے؟

مریم فاطمہ۔ کراچی

یہ بہت پرانی کہانی ہے۔ کسی ملک میں ایک رحم دل اور انصاف پسند بادشاہ حکومت کرتا تھا۔اس کی رعایا بہت خوش اور خوش حال تھی۔ نہ اس ملک میں کوئی بھوکا تھا اور نہ فقیر۔ سبھی اچھی اور خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ان کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔وہ بدقسمتی نام کی چیز کو جانتے تک نہیں تھے۔

ایک روز بادشاہ نے اپنی مملکت کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔وہ اپنے لوگوں سے خود مل کر ان کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ چناں چہ وہ متعدد تاریخی مقامات پر گیا اور اپنی سلطنت کے کئی مذہبی مقامات کی زیارت بھی کی۔بادشاہ نے یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنی مملکت میں رہنے والے عام لوگوں سے ملے گا،ان سے بات چیت کرے گا اور ان کے مسائل جاننے کی کوشش کرے گا، تاکہ بعد میں انہیں حل بھی کر سکے،اس لیے اس نے گھوڑا گاڑیوں یا دیگر سواریوں کے ذریعے سفر کرنے کے بجائے یہ تمام سفر پیدل طے کیے۔ وہ اپنے ملک کے دور دراز مقامات تک گیا،اس نے نہ کوئی گاؤں چھوڑا اور نہ شہر۔وہ جہاں بھی گیا،وہاں کے لوگ اس سے مل کر بہت خوش ہوئے۔وہ حیران تھے کہ ان کا بادشاہ ان کے پاس پیدل چل کر آیا ہے۔انہیں اس کی سادگی اور رحم دلی بہت اچھی لگی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ اپنے بادشاہ سے محبت کرنے لگے۔

بادشاہ نے کئی ہفتوں تک اپنی مملکت کا دورہ کیا اور پھر واپس اپنے محل لوٹ آیا۔بادشاہ مطمئن تھا کہ اس نے دور دراز مقامات اور خاص طور سے مذہبی مقامات کی زیارت کر لی،اپنے لوگوں سے مل لیا اور یہ کہ ان کے مسائل بھی معلوم کر لیے۔وہ اس بات پر خوش تھا کہ اس کے لوگ بہت خوش بھی ہیں اور خوش حال بھی۔

لیکن ایک چیز نے بادشاہ کو بہت دکھی کر دیا تھا۔چوں کہ اس نے زندگی میں پہلی بار ننگے پاؤں یہ طویل سفر طے کیا تھا،اس لیے اس کے پیروں میں سخت تکلیف ہو گئی تھی۔ ننگے پاؤں ان پتھریلے اور تکلیف دہ راستوں پر چل کر اس کے پیر زخمی ہو گئے تھے اور ان میں سخت درد بھی ہونے لگا تھا۔بادشاہ کو احساس ہوا کہ جب اسے اتنی تکلیف ہو رہی ہے تو اس کی رعایا کو تو اور بھی زیادہ تکلیف ہو گی۔اس نے یہ نتیجہ یہ نکال لیا تھا کہ اس کی مملکت کی سڑکیں اور راستے بہت خراب ہیں، جن کی وجہ سے اس کے عوام بھی روزانہ یہ دکھ جھیلتے ہیں۔اسے اپنے دکھ سے زیادہ اپنی رعایا کی تکلیف کا احساس ہوا تو وہ بہت فکر مند ہو گیا۔

کافی سوچ بچار کے بعد بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ پوری سلطنت کے راستوں اور سڑکوں پر فوری طور پر چمڑا بچھا دیا جائے، تاکہ ان پر چلتے ہوئے لوگوں کو تکلیف نہ ہو اور وہ آرام سے اپنا سفر طے کر سکیں۔بادشاہ کا خیال تھا کہ جب تمام سڑکوں اور راستوں پر چمڑا بچھا دیا جائے گا تو اس کے لوگ بہت خوش ہوں گے اور اسے ان کی خوشی زیادہ عزیز تھی۔

بادشاہ کا حکم سن کر اس کے تمام وزیر سناٹے میں آ گئے، کیوں کہ اس کے لیے بہت زیادہ چمڑے کی ضرورت تھی اور یہ چمڑا حاصل کرنے کے لیے ہزاروں جانوروں کو قربان کرنا پڑتا جس سے قومی خزانے پر بہت بوجھ پڑتا۔ سب وزیروں نے باہم مشورے کے بعد اپنے سب سے عقل مند وزیر کو بادشاہ سلامت کی خدمت میں بھیجا جس نے بادشاہ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا: ”جہاں پناہ! میں آپ کی خدمت میں ایک تجویز لایا ہوں۔اجازت ہو تو عرض کروں۔“

بادشاہ نے اجازت دے دی تو وزیر نے کہا: ”عالم پناہ! سڑکوں پر اتنا سارا چمڑا بچھانے کے لیے بہت زیادہ جانوروں کو قربان کرنا ہو گا،اس کے بجائے اگر پیر کے سائز کا چمڑا کاٹ کر اسے پیر کی بناوٹ کے مطابق کر کے اس سے پیر کو ڈھک دیا جائے تو کیا یہ بہتر نہیں ہو گا؟“

یہ تجویز سن کر بادشاہ حیران رہ گیا۔اس نے وزیر کی پیٹھ ٹھونکی اور اس کی تعریف بھی کی۔اس کے بعد جوتوں کی ایک جوڑی تیار کی گئی جو بادشاہ سلامت کو اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اپنے پورے ملک میں یہ فرمان جاری کر دیا کہ اب سب لوگ اسی طرح جوتے پہنیں گے، تاکہ ان کے پیر پتھریلے راستوں پر چلنے سے زخمی نہ ہوں اور وہ اپنا سفر آرام سے طے کر سکیں۔بادشاہ کے اس حکم پر اس ملک کے سبھی لوگ خوش ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی ان کا بادشاہ بہت رحم دل ہے جبھی اسے ہر وقت اپنی رعایا کا خیال رہتا ہے۔n

کائیں کائیں

عثمان اکرم، ملتان

مغرب کی اذان ہوتے ہی تمام پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف چل پڑے، مگر کوے میاں جو صبح سے بھوکے تھے، دانے دنکے کی تلاش میں اب بھی ادھر ادھر بھٹک رہے تھے، انہیں کوئی بھی ایسی چیز نظر نہیں آرہی تھی جسے کھا کر وہ اپنی بھوک مٹا سکیں۔ پھر کوے میاں بھوک کے مارے اپنے لڑکھڑاتے ہوئے پروں سے اڑے اور ڈگمگاتے ہوئے ایک گاؤں میں جا پہنچے۔ گاؤں میں ایک گھر کی چھت پر بشرہ مائی بیٹھی تھیں۔ وہ گوشت پکانے کے لیے اسے پانی سے دھو کر صاف کر رہی تھیں۔ کوے میاں سیدھے ان کی چھت کی منڈیر پر جا بیٹھے اور کائیں کائیں شروع کر دی۔ بشرہ مائی سمجھیں کہ شاید کوئی مہمان آرہا ہے۔ انہوں نے جلدی سے گوشت ایک پلیٹ سے ڈھانپ کر وہیں رکھا اور گھر کی صفائی ستھرائی کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ظاہر ہے پرانے لوگ ہمیشہ سے یہ کہتے آئے ہیں کہ جب کوئی کوا گھر کی چھت پر آکر کائیں کائیں کرے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ہاں کوئی مہمان آنے والا ہے۔ بشرہ مائی بھی یہی سمجھیں مگر اس کوے نے تو حد ہی کر دی تھی، وہ مسلسل کائیں کائیں کیے جا رہا تھا۔ وہ جلد ہی اس کی کائیں کائیں سے اکتا گئیں اور غصے میں ایک پتھر اٹھا کر کوے کے مارا۔ مگر کوے میاں اتنے نڈر نکلے کہ وہ وہیں بیٹھے رہے۔ گھر کی صفائی کرنے کے بعد بشرہ مائی ایک بار پھر چھت پر گئیں اور گوشت صاف کرنے لگیں۔ اب تو کوے میاں نے اور بھی تیز آواز میں کائیں کائیں شروع کر دی۔ ان کی آواز میں بے قراری نمایاں تھی۔ یہ دیکھ کر بشرہ مائی سمجھ گئیں کہ یہ کوا بھوکا ہے۔ انہوں نے گوشت کا ایک ٹکڑا ہوا میں اچھالا، جونہی کوے میاں نے گوشت کا ٹکڑا دیکھا، وہ اس کی طرف لپکے اور اسے اپنی چونچ میں پکڑ لیا۔ پھر چھت پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے گوشت کا وہ پورا ٹکڑا کھا لیا اور واپس آکر ایک بار پھر کائیں کائیں شروع کر دی۔ بشرہ مائی نے سوچا کہ لگتا ہے یہ کافی دن سے بھوکا ہے۔ انہوں ایک اور گوشت کا ٹکڑا ہوا میں اچھالا۔ کوے میاں نے اسے بھی اپنی چونچ میں پکڑ لیا۔ گوشت کا وہ ٹکڑا ختم کرنے کے بعد کوے میاں ایک بار پھر واپس آئے اور کائیں شروع کر دی۔ اب تو بشرہ مائی کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ انہوں نے رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سارا گوشت چھت پر پھینک دیا۔ کوے میاں نے پہلے تو پیٹ بھر کر گوشت کھایا اور جو باقی بچا، اسے وہ ایک ایک ٹکڑا کر کے اپنے گھونسلے پر لے گئے۔ جب کوا گوشت کا آخری ٹکڑا اٹھانے آیا تو جاتے وقت اس نے آخری بار بشرہ مائی کی طرف دیکھ کر کائیں کائیں کی آواز بلند کی اور اڑ گیا۔ یہ آخری کائیں کائیں بشرہ مائی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے تھی۔ n

خالہ نص یبن

فاطمہ معین کوٹھاری۔ کراچی

یہ محلہ یوں تو پرانے شہر کا محلہ ہے جس کا کبھی کوئی نام بھی ہو گا، لیکن اب لوگوں کو وہ نام تو یاد نہیں، البتہ سب اسے محلّہ نصیباں کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کی وجہ خالہ نص یبن ہیں جو کونے والے مکان نمبر 42 میں رہتی ہیں۔ خالہ نص یبن کی پیدائش بھی اسی محلے کی ہے۔ بس فرق اتنا ہوا کہ شادی سے پہلے مکان نمبر 16 میں رہتی تھیں اور چاچا شکور سے شادی کے بعد مکان نمبر 42 میں آگئیں۔ خالہ نص یبن کو یوں تو اپنے گھر کی صفائی ستھرائی کا بہت شوق تھا، سارا دن اوپر سے نیچے تک پورے گھر کی صفائی ہو رہی ہے۔ کبھی قالین جھاڑا جا رہا ہے تو کبھی دیواریں صاف کی جا رہی ہیں۔ اس شوق کا نشانہ اکثر محلے کے بچے بھی بنتے ہیں۔ ذرا کسی کی گیند یا پتنگ خالہ کے گھر میں آگئی، اس بچے سے جب تک گھر کا کوئی کام نہیں کروا لیں گی، اس کو گیند یا پتنگ واپس نہیں ملے گی۔

لیکن خالہ نص یبن کی اصل وجۂ شہرت یہ تھی کہ اپنا گھر تو وہ صاف رکھتی تھیں، لیکن اپنے گھر کا سارا کوڑا کرکٹ بڑے بے پروائی سے گلی میں ڈال دیتی تھیں۔ اس پر پڑوسی احتجاج کرتے، بہت سے لوگ ناراض بھی ہو جاتے، محلے والے آکر خالہ کو سمجھانے کی کوشش کرتے، مگر وہ خالہ ہی کیا جو کسی کی بات مان لیں۔

جمعے کے دن جب عبدالغفور سبزی والا حسب معمول باسی سبزیوں پر خوب پانی چھڑک کر صدا لگاتا ہوا ان کی گلی سے گزر رہا تھا تو پڑوسن آپا شبراتن نے اوپر سے ٹوکری لٹکائی، ساتھ ہی وہ اوپر سے سبزی والے کو ہدایات دے رہی تھیں کہ اچانک خالہ نص یبن گیلری میں برآمد ہوئیں۔ انہوں نے دائیں دیکھا نہ بائیں، اپنے گھر کا پرانا قالین گیلری سے نیچے لٹکا کر زور زور سے جھاڑنا شروع کر دیا۔

بس پھر کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے پورا ماحول گرد آلود ہو گیا۔ اس کے بعد عبدالغفور کی سبزیاں پہلے سے بھی زیادہ باسی لگنے لگیں۔ آپا شبراتن کی ٹوکری سبزیوں کے بجائے گرد سے بھر گئی۔

پھر ایک اور غضب ہو گیا! وہ یہ کہ چاچا عبدالشکور اپنے سفید کلف لگے کپڑے پہنے بڑے اہتمام سے نماز جمعہ ادا کرنے جا رہے تھے کہ وہ بھی اس گرد کے طوفان میں خاک آلود ہو گئے، پھر کیا ہوا، یہ لکھا نہیں جا سکتا۔ انہوں نے اور دیگر محلے والوں نے خالہ کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا، مگر خالہ بڑی شان بے نیازی سے وہاں سے چلی گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس دن کے بعد محلے والوں نے خالہ نص یبن کا بائیکاٹ کر دیا۔ نہ ان سے ملتے جلتے تھے، نہ ان کے گھر کچھ بھیجتے تھے، بلکہ اگر خالہ کبھی کچھ لاتیں تو سبھی نے ان سے لینے سے انکار کر دیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ خالہ اپنی عادت سے مجبور تھیں، مگر وہ محلے والوں کی بے رخی زیادہ دن برداشت نہ کر سکیں اور بیمار پڑ گئیں۔ جب محلے والوں کو ان کی بیماری کا پتا چلا تو سب ان کی خیریت پوچھنے گئے۔ خالہ انہیں ایک ساتھ اپنے گھر میں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے سب لوگوں سے اپنے رویے کی معافی مانگی اور یہ وعدہ کیا کہ آئندہ وہ محلے والوں کو کوئی تکلیف نہیں دیں گی۔ محلے والے خوش خوش واپس چلے آئے۔ اب خالہ نص یبن سے کسی کو کوئی شکایت نہیں ہے۔n

خطا کا پتلا

شاہ بہرام انصاری۔ ملتان

پروفیسر فہیم نے بلیک بورڈ پر جیومیٹری کی کچھ اشکال اور سوالات سمجھانے کے بعد پوچھا: ”سب سمجھ میں آگیا؟“ کچھ طلبہ نے ہاں میں جواب دیا اور کچھ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ سر فہیم کی نظر آخری ڈیسک پر بیٹھے ثاقب پر پڑی جو اپنی عینک رومال سے صاف کر رہا تھا۔ انہوں نے اس سے کہا: ”ثاقب! تم بتاؤ کہ سوال کا منطقہ تمہاری سمجھ میں آگیا؟“

سر فہیم کو ثاقب سے خاص لگاؤ تھا، اس لیے وہ اکثر اس سے ضرور پوچھتے تھے۔

”سر جی! اس کی عقل میں کیسے آئے گا؟ اس کے دماغ میں تو......“ نعمان کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ کلاس کے سب طلبہ ہنسنے لگے۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے!“ سر فہیم نے غصے سے کہا۔ ان کی رعب دار آواز گونجتے ہی کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ تمام طلبہ دوبارہ اپنے کام میں لگ گئے۔ نعمان کا تعلق امیر گھرانے سے تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ غربت کیا چیز ہے۔ دوسری طرف ثاقب کو اپنی تعلیم کے لیے اضافی کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کے ابو جو کچھ کماتے، وہ سب گھر کی دال روٹی پر اٹھ جاتا تھا۔ ثاقب صبح اسکول جاتا اور چھٹی کے بعد دوپہر سے شام تک ایک درزی کی دکان پر ہیلپر کا کام کرتا تھا جس کے اسے پچاس روپے ملتے تھے۔ گھر آکر وہ رات گئے تک اسکول کا کام کرتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ موٹے شیشوں والی عینک لگانے کے بعد اسکول میں ثاقب کا مذاق اڑنے لگا تھا، مگر وہ خاموش رہتا اور اب تو اسے ایسی باتوں کی عادت ہو گئی تھی۔ دیر سے آنے کی وجہ سے وہ کلاس میں آخری سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ نعمان کو ثاقب سے نہ جانے کیا چڑ تھی کہ وہ اکثر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتا تھا۔ نعمان نے ثاقب کی بہت عجیب و غریب نام رکھے ہوئے تھے اور وہی اسے سب سے زیادہ تنگ کرتا تھا۔

سر فہیم کا پیریڈ ختم ہوتے ہی بیل بجی اور سب طلبہ باہر چلے گئے جن میں ثاقب بھی شامل تھا۔ کلاس سے باہر آتے ہی نعمان پھر شروع ہو گیا۔ مگر آج ثاقب اپنی توہین برداشت نہ کر سکا اور اس کے منہ سے بے اختیار نعمان کے لیے بد دعا نکل گئی۔ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔

یہ اسی رات کی بات ہے۔ جب نعمان معمول کے مطابق کمپیوٹر سے اٹھا تو اسے سب کچھ دھندلا سا دکھائی دیا۔ پھر اس کی نظر سے سیڑھیاں بھی اوجھل ہونے لگیں۔ وہ گھبرا کر چیخنے لگا۔ امی ابو دوڑتے ہوئے اس کے کمرے میں آئے۔ اتفاق سے ان کے پڑوسی ندیم آنکھوں کے ڈاکٹر تھے۔ نعمان کے ابو جلدی سے انہیں بلا لائے۔

ڈاکٹر ندیم نے اس کی آنکھوں کا معائنہ کر کے بتایا کہ اس کی نظر کمزور ہو گئی ہے اور اسے عینک کی ضرورت ہے۔ یہ سن کر نعمان ہکا بکا رہ گیا اور پھر اس کی آنکھوں پر عینک لگ گئی۔

دو تین دن آرام کرنے کے بعد وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو بہت اداس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ثاقب اس سے ضرور بدلہ لے گا۔ اسی کشمکش میں وہ اسکول پہنچا تو اس کے سب دوست اسے دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ پھر اسے ثاقب دکھائی دیا تو وہ واپس مڑنے لگا لیکن ثاقب نے اسے آواز دی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ نعمان بول اٹھا: ”ثاقب! مجھے معاف کر دو! میں غلطی پر تھا جو تمہارا مذاق اڑاتا تھا۔ اللہ نے مجھے تمہیں ستانے کی سزا دی ہے جسے میں عمر بھر بھگتوں گا۔“

نعمان کی بات سن کر ثاقب کا دل پسیج گیا۔ اس نے کہا: ”میرے دوست! انسان تو خطا کا پتلا ہے، جانے انجانے میں اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ تم راہِ راست پر آگئے ہو۔ جس عظیم ذات نے تمہیں اس امتحان میں ڈالا ہے، وہی تمہیں اس سے باہر نکالے گا۔“

ثاقب کی باتیں سن کر نعمان کو لگا کہ اس کا دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب ثاقب نے اسے معاف کر دیا ہے تو اللہ بھی اسے معاف کر دے گا۔ n

خواب کی تعبیر

محمد شعیب خان۔ واہ کینٹ

ذیشان نے آج پھر نیند میں چیخنا شروع کر دیا:

"خون، خون، امی مجھے بچالو، خون۔"

امی کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ امی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئیں، مگر وہ پہلے ہی جاگ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ چند لمحوں میں اس کے ابو بھی کمرے میں پہنچ گئے۔

"کیا ہوا ذیشان بیٹے؟ کیا تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ تم میرے پاس آکر سو جاؤ۔" امی نے ذیشان کو بستر سے اٹھایا۔

ذیشان، امی کے ساتھ چلا تو گیا، لیکن ساری رات سو نہ سکا۔

صبح امی ابو نے ذیشان کی لال آنکھیں دیکھیں تو پریشان ہو گئے۔ آج یہ واقعہ دوسری بار ہوا تھا، پچھلے اتوار کو بھی یہی سب ہوا تھا۔

ناشتہ کر کے ذیشان چلا گیا تو ابو نے امی سے کہا: "آج دوسری بار یہ ہوا ہے۔"

"نہ جانے میرے بچے کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟" امی نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"بعض اوقات خواب بار بار بھی دکھائی دیتے ہیں، ہمیں زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے۔" ابو نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور دفتر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

رات کو ذیشان امی کے پاس سویا۔ اگلے دو روز خیریت سے گزر گئے۔ امی ابو خوش تھے کہ ذیشان کا اس خواب سے پیچھا چھٹ گیا ہے۔

ذیشان آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ وہ کلاس کے محنتی اور لائق طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔ اساتذہ اور ہم جماعت بھی اس کی تعریفیں کرتے تھے۔ لیکن اس نے اپنے خونی خواب کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔

اتوار کو وہ اپنے ابو امی کے ساتھ سیر کے لیے پارک میں جاتا تھا۔

رات کو اس نے ہوم ورک مکمل کیا۔ ابو اس کے قریب بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ذیشان نے دو تین بار ابو کی طرف دیکھا تو انہوں نے اس سے کہا: "کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ابو! صبح کتنے بجے پارک جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"بیٹا! پارک میں شام کو چلیں گے۔" ابو نے جواب دیا۔

"ابو! اس بار میں وہاں خوب کھیلوں گا اور پھول بھی لاؤں گا۔" ذیشان نے کہا تو ابو سر ہلا کر دوبارہ پڑھنے لگے۔

اتوار کو صبح ذیشان کے ماموں اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر آگئے۔ ماموں بڑے زندہ دل تھے اور ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔

ان کی آمد سے گھر میں رونق ہو گئی۔ ذیشان کا ماموں زاد بھائی فہیم اس کا ہم عمر تھا۔ وقت کا پتا ہی نہ چلا، پھر ابو نے انھیں پارک چلنے کو کہا۔ پارک میں میلے کا سماں تھا۔ پہلے سب نے خوب سیر کی، پھر کھانا کھایا اور اس کے بعد ذیشان اپنی پسند کے پھول توڑنے جانے لگا تو امی نے ہمیشہ کی طرح اسے منع کیا، لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔

کچھ دیر بعد ذیشان رنگ رنگ کے پھول جمع کیے آیا تو بہت خوش تھا۔ ماموں نے اسے دیکھتے ہی کہا: "اتنے سارے پھولوں کا کیا کرو گے؟"

"انھیں اپنے کمرے میں سجاؤں گا۔" ذیشان نے جواب دیا۔

اتنے میں پارک کا مالی وہاں آگیا اور اس نے ذیشان کی شکایت کرتے ہوئے کہا: "آپ کے بچے نے پھول توڑ کر پودوں کا ستیاناس کر دیا ہے، میری ساری محنت ضائع ہو گئی ہے۔"

ذیشان چپ چاپ کھڑا رہا۔ ماموں بھی سخت نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اب معاف کر دیں، آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا!" ذیشان کے ابو نے معذرت کرتے ہو کہا۔

"صاحب! میں کیسے معاف کر دوں، اس نے تو پودوں کی شاخیں بھی توڑ دی ہیں۔" مالی بابا نے نرمی سے جواب دیا۔

"چلیں رہنے بھی دیں، بچہ ہے۔" امی نے نرمی سے کہا۔

"آپ کو تو اسے سمجھانا چاہیے، الٹا آپ اس کی حمایت کر رہی ہیں۔" یہ کہہ کر مالی بابا بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

واپسی پر ماموں اپنے گھر چلے گئے اور ذیشان کی فیملی اپنے گھر پہنچ گئی۔ گھر آکر ذیشان نے پھولوں کو اپنے کمرے میں سجایا۔

جلد ہی سب سو گئے۔ آدھی رات کو پھر وہی ہوا۔ ذیشان کی چیخیں سن کر امی اور ابو دوڑے چلے آئے۔ ذیشان کی حالت بری ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا میرے بچے کو!" امی نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"امی۔۔۔امی۔۔۔" وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔

"بیٹا! کچھ بھی تو نہیں ہے، دیکھو، ہم تمھارے پاس کھڑے ہیں۔" ابو نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

پھر ساری رات تینوں کو نیند نہ آئی۔ اب امی، ابو سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کر رہے تھے۔

اگلے روز ابو دفتر گئے تو ان کی طبیعت بوجھل تھی۔ ذیشان کی طبیعت نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ دفتر پہنچ کر انھوں نے اس خواب کا تذکرہ پہلی مرتبہ اپنے دوست زاہد صاحب سے کیا۔ زاہد صاحب نے کہا: "ہم ذیشان کو اپنی مسجد کے پیش امام کے پاس لے چلیں گے اور ان سے اس معاملے میں مشورہ کریں گے۔"

اگلے روز جب زاہد صاحب، ذیشان اور اس کے ابو کو امام صاحب کے پاس لے کر پہنچے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ امام صاحب پارک کے مالی بابا تھے۔ سلام دعا کے بعد تینوں اندر چلے گئے۔ ذیشان کے ابو نے انہیں ذیشان کے خواب کے بارے میں بتایا تو مالی بابا (امام صاحب) نے کہا: "میں سمجھ گیا، اس معاملے میں سارا قصور بچے کا ہے ۔ یہ کئی ماہ سے باغ کے پھولوں اور پودوں کو توڑ رہا ہے۔ یہ گویا پودوں کا خون کرتا ہے۔"

یہ سنتے ہی ذیشان اور اس کے ابو نے مالی بابا سے معذرت کی۔

مالی بابا بولے: "بیٹا! پودے اور درخت بھی ہماری طرح سانس لیتے ہیں، وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ بڑے ہوتے ہیں اور غذا کھاتے ہیں۔ وہ صرف ہماری طرح چل پھر نہیں سکتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کا خون کریں۔"

اس کے بعد ذیشان کو خونی خواب نے کبھی تنگ نہیں کیا، بس ایک تبدیلی ہوئی کہ اب اس کے گھر میں ہر طرف سرسبز پودوں کی بہار ہے، جن میں شوخ رنگوں کے تروتازہ پھول اپنی خوشبوؤں سے فضا کو معطر کر رہے ہیں۔

n

خوش آمدید

مہر منظور جونیئر۔ ساہی وال

کرنیں ساتھیو! آپ کو نیا سال مبارک ہو اگرچہ گزرا سال امن وامان کے حوالے سے اچھا نہیں تھا، مگر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس میں سال یا وقت کا کیا قصور؟ ہم نے وقت کو جیسا برتا، وہ ویسا ہی ثابت ہوا۔

وقت یا سال ایک طرح سے ہمارا مہمان ہوتا ہے۔ ہم اس کو جو کچھ دیتے ہیں، وہ جواب میں ویسا ہی برتاؤ ہمارے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن ہم سب کو مل کر یہ دعا کرنی چاہیے کہ یہ سال ہمارے وطن پاکستان کے لیے امن اور خوش حالی کا سال ثابت ہو۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب اپنی اپنی ذمے داری نبھائیں اور اس ملک کی سربلندی اور استحکام کے لیے بڑھ چڑھ کر کام کریں۔

ساتھیو! کیوں نہ آج ہم سب مل کر عہد کریں کہ اس سال ہم اپنی نیکیوں کا بیلنس بڑھائیں گے۔ جھوٹ، حسد، غیبت اور حرص جیسی برائیوں سے اپنی ذات کو پاک و صاف کر کے اپنی شخصیت کو سنواریں گے۔ کسی کلاس فیلو، دوست، پڑوسی یا رشتے دار کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ سب سے اہم بات یہ کہ گزرے سال کا جائزہ لیں گے اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ ہم نے اس سال کیا کیا کامیابیاں حاصل کیں اور کہاں کہاں ناکام رہے؟ پھر کوشش کرنی ہوگی کہ ہم سے اس سال وہ غلطیاں نہ ہوں جو پچھلے سال ہوئی تھیں۔

آئیے دعا کریں:

"اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں میں امن، پیار اور محبت کی شمع روشن کردے اور ہمارے دلوں کو نفرتوں سے ہمیشہ کے لیے پاک کردے۔ ہمارے لیے یہ نیا سال مبارک کردے اور اپنی نعمتوں سے ہماری جھولیاں بھردے۔ آمین

خوش قسمت کون؟

مرزا ظفر بیگ

ایک بحری جہاز اپنے مسافروں کو لے کر سمندر میں سفر کر رہا تھا کہ راستے میں طوفان آگیا جس نے جہاز کو تباہ کر دیا۔ صرف دو مسافر احمد اور دانش بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح تیرتے ہوئے ایک چھوٹے سے ویران جزیرے تک پہنچ گئے۔ان کی جانیں تو بچ گئی تھیں، مگر اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ کہتے ہیں کہ مصیبت کی گھڑی میں خدا یاد آتا ہے تو انہیں بھی یاد آگیا۔انہوں نے دعا مانگنے سے پہلے یہ دیکھنے کے لیے کہ خدا کس کی دعا قبول کرتا ہے، اس جزیرے کو آدھا آدھا بانٹ لیا اور اپنے اپنے علاقے میں بیٹھ کر دعا مانگنی شروع کر دی۔ سب سے پہلے انہوں نے خوراک کے لیے دعا کی، اگلے روز دانش نے دیکھا کہ اس کی زمین پر ایک پھل دار درخت اگا ہوا ہے۔اس نے جی بھر کر پھل کھائے، مگر احمد کی زمین بنجر ہی رہی۔ ایک ہفتے بعد دانش نے خدا سے دعا کی کہ اسے ایک بیوی عطا کر دے۔

دوسرے روز ایک بحری جہاز کو سمندر میں حادثہ پیش آیا جس میں صرف ایک عورت بچ سکی اور وہ تیرتی ہوئی دانش کے علاقے میں پہنچ گئی۔ دانش نے اس سے شادی کر لی، مگر احمد ابھی تک ہر چیز سے محروم تھا۔اب دانش نے گھر، لباس اور مزید خوراک کی دعا کی اور کسی جادو کی طرح اسے ہر چیز ملتی چلی گئی۔ لیکن احمد کو کچھ نہ مل سکا۔

اب دانش نے خدا سے دعا کی کہ وہ کوئی کشتی بھیج دے، تاکہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس ویران جزیرے سے چلا جائے۔ دوسرے روز وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جزیرے کے ساحل کے ساتھ ایک بڑی اور مضبوط کشتی لنگر انداز ہے۔ دانش نے اپنی بیوی کو کشتی پر سوار کرایا۔ وہ احمد کو اس جزیرے پر چھوڑ جانا چاہتا تھا، کیوں کہ اس کے خیال میں احمد ایک بد نصیب انسان تھا جس کی کسی بھی دعا کو خدا نے قبول نہیں کیا تھا۔

دانش جزیرے سے روانہ ہونے والا تھا کہ یکایک ایک فرشتہ اس کے سامنے نمودار ہوا اور کہا: ”تم اپنے ساتھی احمد کو اس جزیرے پر تنہا چھوڑ کر کیوں جا رہے ہو؟“

”میں نے خدا سے دعا کی تو اس نے میری ہر دعا قبول کی اور مجھے یہ انعامات دیے۔ لیکن احمد کی کوئی دعا قبول نہیں ہوئی، یہ بد نصیب انسان خدا کو راضی نہیں کر سکا۔“ دانش نے فخر سے کہا۔

فرشتے نے کہا: ”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ تم نے تو خدا سے ڈھیروں دعائیں مانگی تھیں، مگر احمد نے صرف ایک دعا کی تھی جو اس نے قبول کی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم آج اتنے خوش نہ ہوتے۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“ دانش نے کہا۔

”احمد نے خدا سے صرف یہ دعا کی تھی کہ وہ تمہاری ہر دعا قبول کر لے۔“ فرشتے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

n

کیا فرق ہے؟

روبینہ ناز۔ کراچی

ایک بادشاہ خود تو بہت رحم دل اور نیک انسان تھا، مگر اس کا ولی عہد شہزادہ اتنا ہی بے رحم اور تلخ مزاج تھا۔ جب دیکھو غصے میں تیوری چڑھائے خادموں کو ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا اور انہیں مارتا پیٹتا بھی تھا۔ بادشاہ کو یہ سب خبریں برابر ملتی رہتی تھیں جنھیں سن کر اسے بہت رنج ہوتا۔ اس نے کئی بار اشاروں اشاروں میں اپنے ولی عہد کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا اور وہ پہلے کی طرح بدمزاجی اور ظلم و زیادتی کا مظاہرہ کرتا رہا۔

اتفاق کی بات کہ کچھ عرصے بعد ولی عہد کے ہاں ایک شہزادے کی پیدائش ہوئی تو وہ بہت خوش ہوا۔ بادشاہ سلامت اور ان کی ملکہ بھی محل میں ایک ننھے فرشتے کی آمد پر بہت خوش تھے۔ اس خوشی میں ایک زبردست جشن بھی منایا گیا۔

یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ محل کے ایک ملازم کے ہاں بھی اسی دن ایک بیٹا پیدا ہوا، مگر چوں کہ وہ غریب کا بیٹا تھا، اس لیے اس کی پیدائش پر کوئی جشن نہیں منایا گیا۔

بادشاہ سلامت کو یہ اطلاع ملی تو انہوں نے اس ملازم کے بچے کو بلوایا اور محل میں ایک مسہری پر اپنے ولی عہد کے بیٹے کے برابر میں لٹانے کا حکم دیا۔ ولی عہد بادشاہ کی یہ بات سن کر حیران ہوا۔ پھر بادشاہ نے ولی عہد کو مخاطب کر کے کہا: ”ان دونوں میں سے تمہارا بیٹا کون ہے؟ پہچان سکتے ہو؟“

ولی عہد نے مسہری پر لیٹے ہوئے دونوں شیر خوار بچوں کو دیکھا اور چکرا گیا، وہ ان میں سے اپنے شہزادے کو نہ پہچان سکا تھا۔

اس کی کیفیت دیکھ کر بادشاہ سلامت نے ولی عہد سے کہا: ”تم نے دیکھ لیا ناں کہ غریب اور بادشاہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔“

ولی عہد نے کہا: ”جی مجھے ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔“

بادشاہ نے کہا: ”بے شک! ان دونوں کوئی فرق نہیں۔ جب خدا نے ہی ان میں کوئی فرق نہیں رکھا تو تم کیوں فرق رکھتے ہو؟“

بادشاہ سلامت کی بات سن کر شہزادہ شرمندہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے محل کے خادموں کو کبھی تنگ نہیں کیا۔n

کتابوں کی فریاد

لائبہ عمر، کمالیہ

رات گہری ہو چکی تھی۔ سب مزے سے سو رہے تھے۔ اتنے میں سعد کے کمرے سے مدھم سی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ یہ آوازیں کسی انسان کی نہیں، بلکہ سعد کی خراب اور خستہ حال کتابوں کی تھیں۔

ایک کتاب نے کہا: ”یہ سعد اپنی کتابوں پر کبھی جلد نہیں چڑھواتا اور اگر چڑھواتا ہے تو ان کی حالت جلد خراب کر دیتا ہے۔ پھر پورا سال پلٹ کر انہیں نہیں دیکھتا۔“

ایک اور کتاب بولی: ”یا اللہ! مجھے تو اپنا آپ برا لگ رہا ہے۔ سعد نے مجھے اتنا گندا رکھا ہوا ہے کہ دوسری کتابوں سے مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔“

دوسری کتاب جو اردو کی تھی، کہنے لگی: ”سعد ایک طالب علم ہے۔ اس کے استاد اسے یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ لیکن صفائی صرف جسم کی نہیں، بلکہ ہر چیز کی ہونی چاہیے۔ ہماری وجہ سے لوگ جاہل سے عالم، ڈاکٹر اور انجینئرز وغیرہ بنتے ہیں، پھر ہمیں صاف کیوں نہیں رکھا جاتا؟“

اسی وقت ایک طرف رکھی ایک خوب صورت سی کتاب بولی: ”میں کتنی خوب صورت اور صاف ستھری ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں سعد کے دوست کی ہوں۔ میں کم بولتی ہوں، لیکن مغرور نہیں ہوں اور مجھے تم لوگوں کو دیکھ کر بہت افسوس ہو رہا ہے۔“

یکایک سعد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سوچتا رہا کہ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں یا یہ سچ ہے۔ اس نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سب کتابیں واقعی آپس میں باتیں کر رہی ہیں۔ اسے اپنی کتابوں کی باتیں سن کر بہت افسوس ہو رہا تھا۔

اتنے میں پلنگ کے نیچے سے ایک آواز آئی: ”تم سب اپنا اپنا دکھ بیان کر رہی ہو، میری فریاد بھی سنو!“

سعد کے ساتھ سب کتابوں نے نیچے دیکھا تو سعد کے جوتے بول رہے تھے۔ انہوں نے کہا: ”جب سعد سکول سے واپس آتا ہے تو ہمیں بیڈ کے نیچے پھینک دیتا ہے۔“

سعد نے جوتے کی بات سنی تو اسے امی کی بات یاد آئی۔ وہ اسے روزانہ جوتے پر پالش کرنے کو کہتی تھیں، لیکن اسے کھیلنے سے فرصت کب تھی۔

بہر حال آج جوتوں اور کتابوں کی باتیں سن کر اسے بے حد شرمندگی ہو رہی تھی، کیوں کہ اب تو اس کی امی نے اسے جوتے پالش کرنے کو کہنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

اتنے میں اسلامیات کی کتاب بولی: ”اللہ تعالیٰ صاف ستھرے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔“ اس کے بعد سب کتابیں مل کر دعا کرنے لگیں:

”اے اللہ! سعد کو توفیق عطا فرما کہ وہ خود بھی صاف ستھرا رہے اور ہمیں بھی صاف ستھرا رکھے۔“

نہ جانے کب سعد کو نیند آ گئی۔ دوسرے دن صبح اٹھ کر اس نے وضو کیا اور نماز ادا کرنے مسجد میں گیا۔ واپس آ کر اس نے جوتے پالش کیے اور پھر کتابوں پر نئے کور چڑھانے کا ارادہ کر کے اسکول چلا گیا۔ یہ دیکھ کر اس کی امی کو بھی بہت خوشی ہوئی۔ n

لکڑہارے کا انعام

ردا اقبال۔ فیصل آباد

ایک گھنے جنگل میں غریب لکڑہارا رہتا تھا۔وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹتا اور شہر لے جاکر بیچتا تھا۔ایک بار وہ لکڑیاں کاٹ کر شہر لے جارہا تھا کہ راستے میں کسی پتھر سے ٹھوکر کھاکر گرا تو اس کی ٹانگ میں شدید چوٹ لگی۔ مگر آس پاس کوئی نہیں تھا جو اس کی مدد کرپاتا۔ مجبوراً وہ اپنی لکڑیاں پاس رکھ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔درد کم ہوا تو اسے غنودگی محسوس ہوئی،وہ اسی کیفیت میں تھا کہ وہاں سے ایک آدمی گزرا۔اتنی ساری لکڑیاں دیکھ کر اس کی نیت خراب ہوگئی اور وہ لکڑیاں لے بھاگا،اسی وقت بوڑھے کی آنکھ کھل گئی۔اس نے لکڑیاں چوری ہوتے دیکھا تو شور مچایا،مگر تکلیف کی وجہ سے چور کے پیچھے نہ بھاگ سکا۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہوگیا،لکڑہارے کے پاس رات وہیں بسر کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔رات بھر بھوک سے بے حال رہا،یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔وہ درخت کے نیچے کوئی گرا ہوا پھل تلاش کرنے لگا کہ گھاس پھوس کے ڈھیر پر نظر پڑی۔لکڑہارے نے اس ڈھیر کو ہٹایا تو ایک گڑھے میں کچھ کاغذ دکھائی دیے۔وہ مایوس ہوگیا،پھر غیر ارادی طور پر وہ کاغذات لے کر شہر پہنچا۔ شہر میں اسے پولیس اسٹیشن دکھائی دیا تو اس نے سوچے سمجھے بغیر وہ تمام کاغذات وہاں دے دیے۔انسپکٹر نے انہیں دیکھا تو حیران رہ گیا۔یہ ایک گھر اور گاڑی کے کاغذات تھے جن کی چوری کی رپورٹ اس کے پاس درج تھی۔ انسپکٹر نے رپورٹ لکھوانے والے شخص کو فون کرکے بلایا

اور وہ کاغذات اس کے حوالے کردیے۔مالک بہت خوش ہوا۔اس نے لکڑہارے کو انعام بھی دیا اور اسے ملازمت بھی دلوادی۔ n

پالتو مگرمچھ۔ آج تک دوست نہ بن سکا

مرزا ظفر بیگ

جارج کریگ مگرمچھ کے شکاری ہیں۔ ان کی عمر 84 سال ہے۔ وہ گرین آئی لینڈ (آسٹریلیا) میں رہتے ہیں۔ اپنی ساری زندگی انہوں نے خطرناک ترین جانوروں کی تلاش میں گزاری ہے۔ انہیں خوف ناک جانوروں کو پکڑ کر اپنے ساتھ رکھنے کا بہت شوق ہے۔ اس وقت بھی ان کے پاس دنیا کا سب سے بڑا اور خطرناک ترین مگرمچھ ہے۔ اس خوف ناک مگرمچھ کو جارج کریگ نے 30 سال پہلے پکڑا تھا اور اسے کیشس کا نام دیا۔ یہ مگرمچھ 18 فٹ لمبا اور ایک ٹن وزنی ہے۔ اس وقت سے یہ جارج کریگ کے ساتھ رہ رہا ہے۔

دنیا کی ان خطرناک ترین جانوروں کو پکڑنے اور انہیں اپنے ساتھ رکھنے کا شوق جارج کریگ کو کم عمری سے ہی ہے۔ انہوں نے ایک نوجوان کی حیثیت سے اپنی زندگی کے 17 سال ایسے ہی جانوروں کو پکڑنے میں گزار دیے اور ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک جانور پکڑا، لیکن انہیں نہ تو کبھی مارا اور نہ ہی دوسروں کے ہاتھوں فروخت کیا، بلکہ جارج ان کے تحفظ اور سلامتی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ وہ ایسے خطرناک جانوروں کو پکڑ کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ انہوں نے ان کے لیے ایک خصوصی پناہ گاہ بنا رکھی ہے جہاں اپنے پاس رکھ کر وہ ایسے خطرناک جانوروں کو دوسرے لوگوں کے ہاتھوں مرنے سے بچا لیتے ہیں۔

جارج کریگ نے کیشس نامی اس مگرمچھ کو 1987 میں آسٹریلیا کے شمالی علاقے سے پکڑا تھا جہاں اس نے بڑی دہشت پھیلا رکھی تھی جس کی وجہ سے مقامی لوگ اس کی جان کے دشمن بن گئے تھے اور اسے ہلاک کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ وہ بے دھڑک کشتیوں میں سوار لوگوں پر حملے کر دیا کرتا تھا جس کی وجہ سے مقامی لوگوں نے اس سے نجات حاصل کرنے کی پلاننگ کر لی تھی۔ کیشس کا آگے والا پیر نہیں تھا اور اس کی دم کی نوک بھی ٹوٹ چکی تھی۔ خوف ناک لڑائیوں میں ہی وہ اپنے ان اعضاء سے محروم ہوا تھا۔

چناں چہ جارج کریگ نے اس مگرمچھ کی جان بچانے کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ بہر صورت اسے اپنی سین کچوری میں لانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے اس ارادے کو پورا کر کے دکھایا اور اس مگرمچھ کو اپنی میرین لینڈ میلانیشیا میں واقع سین کچوری میں لے آئے جہاں گذشتہ

30 برسوں سے کیشس ان کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جارج روزانہ اسے اپنے ہاتھ سے خوراک دیتے ہیں، اس کے باوجود وہ اس پر بھروسا نہیں کرتے، ان کا کہنا ہے: ''حالاں کہ میں روز اسے کھلاتا پلاتا ہوں، اس کے باوجود کیشس میرا دوست نہیں، بلکہ کٹر دشمن ہے، جس دن اسے موقع مل گیا، وہ لمحوں میں مجھے ہڑپ کر جائے گا۔''

جارج کریگ کا پوتا بلی کریگ اس سین کچوری میں اپنے دادا کی معاونت کرتا ہے، اس نے حال ہی میں بہت سی تصاویر جاری کی ہیں جن میں اس کے دادا کو ان کے پالتو دشمن کیشس کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

بلی کریگ کا کہنا ہے: ''میرے دادا کیشس کو اپنے ہاتھ سے خوراک دیتے ہیں، وہ اس کام میں کسی دوسرے کی مدد نہیں لیتے۔ گذشتہ 30 برسوں سے ان کا یہی طریقہ ہے، ایک نگراں کی حیثیت سے وہ اپنے پالتو مگرمچھ سے بہت پیار کرتے ہیں، مگر یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے پالتو کو جس دن موقع مل گیا، وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کیشس نے اس علاقے میں دہشت پھیلا رکھی تھی جہاں سے اسے میرے دادا پکڑ کر لائے تھے۔ اگر وہ اسے نہ لاتے تو اب تک وہاں کے لوگ اسے ہلاک کر چکے ہوتے۔ یہ مگرمچھ گذشتہ تین دہائیوں سے میرے دادا کے ساتھ رہ رہا ہے، مگر اب تک ان کا دوست نہیں بن سکا اور نہ کبھی بن سکے گا۔'' n

میں پاکستان ہوں

عائشہ طارق۔ دھول کلاں گجرات

وہ دسمبر کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام تھی جب وہ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھا تھا، بالکل بے حس و حرکت! اس کی سسکیوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ایک انسان ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ ہر سال دسمبر میں ایسے ہی روتا تھا۔ جیسے اس کا بہت بڑا نقصان ہو گیا ہو۔ بظاہر تو اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن کچھ ایسا ضرور جو دسمبر میں اس کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ اچانک قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ چونکا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا، ایک بچہ اس طرف آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے، لیکن وہ زبان سے کچھ نہ بولا اور دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔

"آپ کون ہیں؟ اور یہاں بیٹھ کر کیوں روتے ہیں؟" بچے نے سوال کیا تو وہ چپ رہا۔

"جواب کیوں نہیں دے رہے؟ آپ رو کیوں رہے ہیں؟" بچے نے دوبارہ پوچھا، لیکن وہ خاموش رہا۔ مگر بچہ مسلسل سوال کرتا رہا اور پھر وہ چیخ اٹھا: "جاؤ یہاں سے، کیوں آ جاتے ہو مجھے تنگ کرنے؟"

بچہ اس کے چیخنے پر سہم گیا اور خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ نرمی سے بولا: "بیٹھ جاؤ! میں تمھیں بتاتا ہوں کہ یہاں کیوں بیٹھا ہوں اور رو کیوں رہا ہوں؟ آج سے 67 سال پہلے میں نے اس دنیا میں جنم لیا تو بہت خوش تھا کہ میں ایک خاص مقصد کے لیے بنایا گیا ہوں۔ مجھے خود پر فخر محسوس ہوتا تھا، کیوں کہ میں اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا۔ جو لوگ اتنی قربانیاں دے کر اور تکلیفیں اٹھا کر یہاں آئے تھے، وہ بھی بہت خوش تھے کہ اب ہم آزاد ہیں اور آزادی سے رہیں گے۔ انھیں جیسے اپنی زندگی کا مقصد مل گیا تھا۔ ابھی ہم اسی خوشی میں تھے کہ میرے دشمن نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھے توڑنے کے ارادے سے آیا تھا، لیکن میرے شیر جوان اپنی جانوں پر کھیل گئے اور انہوں نے میری حفاظت کی۔ اس کے بعد اس دشمن نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے میری رگوں میں تعصب کی آگ بھرنی شروع کر دی۔ میرے معصوم لوگ دشمن کی اس چالاکی کو نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے قائد کا فرمان بھلا دیا اور ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکے۔ وہ 16 دسمبر 1971ء کی ایک تاریک رات تھی جب میرے ایک بازو کو کاٹ دیا گیا۔ اس کے بعد میری تباہی کا ایک سلسلہ ایسا شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میرے لوگ کیسے بے حس ہو گئے ہیں۔ جب میرے تھر میں بچے پیاس سے بلک بلک کر مر رہے ہوتے ہیں تو بے ساختہ میری نظریں آسمان کی طرف اٹھتی ہیں اور دل سے فریاد نکلتی ہے کہ اے میرے رب! ارباب اختیار کے دل میں رحم پیدا کر۔ انھیں یہ پیاس سے مرتے بچے کیوں نظر نہیں آتے؟ یہ بے حس کیوں ہو گئے ہیں۔ اے اللہ! تو رحم کر اور یہاں بارش برسا دے۔ ان سب کے دلوں میں پیار اور محبت پیدا فرما۔"

وہ تھوڑی دیر سانس لینے کے لیے رکا۔ بچہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ پھر اس نے بچے کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے کہا: "لیکن میں نا امید نہیں ہوں۔ ابھی امید زندہ ہے۔ جب تک امید باقی ہے کوئی میرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کون ہوں تو سنو! میں پاکستان ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا، مگر ایک سوچ، ایک امید اور ایک عزم کا دیا اس بچے کی آنکھوں میں روشن کر گیا۔ ■

میں تیری بات سمجھ گئی

نرگس عامر۔ کراچی

خالدہ ایک چھوٹے اور پس ماندہ گاؤں میں رہتی تھی جہاں کے لوگ جاہل اور گنوار تھے اور تعلیم کو بہت برا سمجھتے تھے۔ وہاں کے بہت کم بچے اسکول جاتے تھے۔ گاؤں میں اسکول کی عمارت تو کیا، چار دیواری تک نہ تھی۔ ایک گھنے درخت کے سائے میں گاؤں کے بوڑھے ماسٹر صاحب ان بچوں کو پڑھاتے تھے جو دریوں پر بیٹھتے تھے۔ ان ہی بچوں میں خالدہ بھی تھی جسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں کی بہت منت سماجت کی تب کہیں جا کر اسے پڑھنے کی اجازت ملی تھی۔ وہ روزانہ خوشی خوشی اسکول جاتی اور گھر میں بھی ہر وقت پڑھتی رہتی تھی۔ اگر اسے کسی اخبار یا رسالے کا کوئی ٹکڑا مل جاتا تو وہ اسے بھی پڑھنے بیٹھ جاتی۔ خالدہ کے گھر والے اس کی عادت سے نالاں تھے۔ ان کا خیال تھا: ”خالدہ اپنا وقت ضائع کرتی ہے، اس سے بہتر ہے کہ وہ گھر کے کام میں اپنا دل لگائے۔ لڑکیوں کو گھر گرہستی میں طاق ہونا چاہیے۔ آگے چل کے یہی سب ان کے کام آتا ہے۔“

خالدہ اپنے گھر والوں کی کسی بات کا جواب نہیں دیتی تھی، کیوں کہ ابھی وہ چھوٹی تھی اور صرف پڑھنا چاہتی تھی۔

ایک دن خالدہ کی بڑی بہن ثریا جو شادی شدہ تھی، رہنے کے لیے گھر آگئی۔ ثریا کی عمر انیس سال تھی لیکن ثریا کے ماں باپ نے کم عمری میں ہی اس کی شادی کر دی تھی۔ خالدہ کا ایک دو سال کا بھانجا تھا جس کا نام سلمان تھا۔ ایک روز سلمان کو بہت تیز بخار ہو گیا۔ وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔ اس وقت گھر میں کوئی مرد نہ تھا۔ ثریا اور اس کی اماں بہت پریشان ہو گئیں۔ اماں نے کہا: ”ثریا بیٹی! اس کا بخار تو اتر ہی نہیں رہا، گھر میں بخار کی ایک پرانی دوا رکھی ہے، میں لاتی ہوں ڈھونڈ کے۔“

خالدہ اس وقت برتن دھو رہی تھی۔ اس نے جب یہ سنا تو پریشان ہو گئی۔ چند روز پہلے اس نے ایک پرانے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی۔ ایک لڑکا اسکول سے گھر آیا تو اس کے پیٹ میں شدید درد تھا۔ اس کی امی نے اسے گھر میں رکھی پرانی دوا پلا دی جس کے بعد وہ لڑکا بے ہوش ہو گیا اور اسے اسپتال لے جانا پڑا جہاں وہ دو روز تک داخل رہا اور بڑی مشکل سے اس کی جان بچ سکی۔ یہ یاد آتے ہی خالدہ، ثریا کے پاس پہنچی جو اپنے بیٹے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ سلمان کو دوا پلانے والی تھی کہ خالدہ نے ہاتھ مار کر دوا کی شیشی گرا دی۔

”یہ کیا کیا تو نے؟“ اماں نے خالدہ کو غصے سے ڈانٹا۔

”اماں! یہ دوا نہیں زہر ہے۔“ خالدہ نے کہا۔

”یہ کیا بکواس کر رہی ہے؟“ اماں چیخیں۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ پرانی دوائیں رکھے رکھے ختم ہو جاتی ہیں اور بہت نقصان دہ بن جاتی ہیں۔“ خالدہ بولی

پھر خالدہ نے انھیں وہ پورا واقعہ سنایا جو اس نے اخبار میں پڑھا تھا۔ پھر بولی: ”اماں! ابھی کچھ روز پہلے ہی گاؤں میں نئی ڈسپنسری کھلی ہے۔ سلمان کو وہاں لے جاتے ہیں۔ اس کا معائنہ بھی ہو جائے گا اور علاج بھی۔“

”میں تیری بات سمجھ گئی!“ اماں نے کہا۔ ثریا کی سمجھ میں بھی خالدہ کی بات آ گئی تھی۔ اماں نے خوش ہو کر خالدہ کو گلے سے لگا لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی ذہانت کی وجہ سے یہ گھر بڑے نقصان سے بچ گیا۔n

میں ضرور پڑھوں گا

روبینہ ناز۔ کراچی

علیم اسکول سے گھر آیا تو اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ اس نے بیگ کو زمین پر پٹخا اور بولا: ”امی! میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا۔“

اس کی بات سن کر امی نے کہا: ”ٹھیک ہے، اگر تمھیں اسکول نہیں جانا تو کل سے اپنے ابو کے ساتھ سبزی کا ٹھیلا لگانا، تاکہ انھیں بھی کچھ مدد مل جائے۔“

علیم دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھا اور پڑھنے سے دل نہیں چراتا تھا، لیکن چند روز سے اس کا موڈ بدل چکا تھا، اب وہ پابندی سے اسکول بھی نہیں جا رہا تھا۔ چوں کہ علیم ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس لیے ماں اور باپ دونوں کا ہی لاڈلا تھا۔ اس سے پہلے جب کبھی وہ اسکول نہ جانے کی ضد کرتا تو اس کے امی ابو اسے پیار سے سمجھا کر اسکول بھیج دیتے، مگر اس بار علیم نے اسکول نہ جانے کا فیصلہ کیا تو اس پر قائم رہا۔

ایک روز اس کے ابو نے علیم کو اپنے پاس بٹھایا اور پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا: ”علیم! تمھاری تو ہمیشہ سے خواہش تھی کہ تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنو گے، تو پھر اب تم پڑھنے سے انکار کر رہے ہو؟ اس کی کیا وجہ ہے؟“

”بس ایسے ہی۔“ علیم نے ٹالتے ہوئے جواب دیا۔

”تمھیں یاد ہے کہ جب تم پانچ سال کے تھے اور میں سبزی کا ٹھیلا لگاتا تھا تو تم میرے ساتھ جاتے تھے اور وہاں بیٹھ کر تم اسکول آتے جاتے بچوں کو دیکھتے اور کہتے تھے: میں بھی اسکول جاؤں گا اور تعلیم حاصل کر کے بڑا آدمی بنوں گا۔ لیکن اب کیا ہو گیا ہے؟“ اس کے والد نے افسردگی سے کہا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ علیم نے جواب دیا۔

”نہیں، مجھے بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے۔“ انھوں نے دوبارہ پوچھا۔ کچھ دیر بعد علیم نے سر اٹھا کر کہا: ”دراصل بات یہ ہے کہ میرے دوستوں کے پاس بہت پیسہ ہے۔ ان کا یونیفارم، کتابیں، کاپیاں غرض ہر چیز ان کے پاس نئی ہے، مگر میرے پاس ہر چیز پرانی ہے۔ میرے تمام دوست ہر جگہ اپنی برتری دکھاتے ہیں اور مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ علیم نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جسے وہ اپنے ابو سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”علیم! تم نے تو ایک ایسی منزل کو پانے کا عہد کیا تھا۔ ہر نئی منزل کو پانے کے لیے کئی رکاوٹیں اور دشوار راستے طے کرنے پڑتے ہیں، مگر تم نے تو ابھی سے ہمت ہار دی۔ کیوں بیٹا؟“ اس کے ابو نے کہا تو علیم کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے ابو نے اسے تسلی دی۔ کچھ دیر بعد علیم نے خود کو سنبھالا۔ اپنے ابو کی باتیں سن کر وہ ایک نئے ارادے اور حوصلے کے ساتھ کھڑا ہوا۔ ایک نظر اپنے بیگ پر ڈالی اور پرعزم لہجے میں بولا: ”ابو! میں ضرور پڑھوں گا۔ کل سے اسکول جاؤں گا اور اپنے اور آپ کے خواب پورے کروں گا۔“ n

مکڑی کا درس

راجہ محمد معراج السلام۔ بھنڈانہ، گوجر خان

یہ اس زمانے کی کہانی ہے جب رابرٹ بروس اسکاٹ لینڈ پر حکومت کرتا تھا۔وہ بہت ہمت والا اور بہادر بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے دور حکومت انگریزوں کے خلاف بہت سی لڑائیاں لڑیں، لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ ہر بار شکست کھا جاتا تھا۔ایک دفعہ لڑائی میں شکست کھانے کے بعد وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا تاکہ اس کی جان بچ جائے۔ لیکن دشمنوں نے اس کا پیچھا جاری رکھا۔کوئی اور راستہ نہ پاکر رابرٹ ایک تنگ و تاریک غار میں چھپ گیا اور اس طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔وہ بہت غمگین تھا اور غار کی دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔وہ مسلسل اپنے مشکل حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔کافی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب مزید لڑائی نہیں لڑے گا، کیوں کہ وہ چاہے کچھ کر لے، اسے پھر شکست ہو جائے گی، فتح اس کے نصیب میں ہے ہی نہیں۔

اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ بہت مایوسی کے عالم میں غار میں بیٹھا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک مکڑی اپنے جالے سے گری اور ریشمی تار سے لٹکنے لگی۔وہ بہت کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح اپنے آپ کو اوپر کر لے، مگر کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ کچھ لمحوں بعد مکڑی نے اپنے جالے تک پہنچنے کی کوشش شروع کر دی لیکن اب بھی وہ کامیاب نہ ہو سکی۔بادشاہ کی نظریں مکڑی پر جمی ہوئی تھیں جس نے نو بار اپنے جالے تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

بادشاہ کو اس کی جدوجہد میں بڑا مزہ آنے لگا تھا۔وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اب مکڑی اپنی جدوجہد ترک کر دے گی اور اپنے جالے تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرے گی، مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مکڑی نے دسویں بار بھی اپنے جالے تک پہنچنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب ہو گئی۔اس واقعے کو دیکھ کر بادشاہ میں ہمت اور جرأت پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں اس نے ایک بار پھر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگلی صبح کو وہ غار سے باہر نکلا۔اس نے اپنی فوج کو دوبارہ جمع کیا، اس کا حوصلہ بڑھایا اور بڑی جرأت مندی سے انگریزوں پر حملہ کیا۔پوری فوج بہادری سے لڑی اور اس بار وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔اس طرح اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ نے ایک مکڑی سے سبق سیکھا اور اس پر عمل کرنے کے بعد اپنی مملکت کا دفاع کرنے میں کامیاب ہوا۔☆

ماریہ کی معافی

محمد علیم نظامی۔ لاہور

عائشہ اور ماریہ بہت ہی با اخلاق اور اچھی لڑکیاں تھیں۔ وہ دونوں بہنیں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی بہت اچھی سہیلیاں بھی تھیں۔ ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ اپنے والدین کا کہنا مانتی تھیں۔

لیکن ماریہ کی ایک عادت بہت خراب تھی، وہ جب بھی بجلی سے چلنے والی کوئی چیز استعمال کرتی تو اس کا سوئچ کھلا چھوڑ دیتی۔

ایک روز ماریہ ٹی وی دیکھ رہی تھی تو اچانک بجلی چلی گئی، لیکن ماریہ نے ٹی وی کا سوئچ آف بند نہیں کیا اور دوسرے کسی کام میں مصروف ہو گئی۔ جب بجلی آئی تو وولٹیج زیادہ تھا جس سے ٹی وی خراب ہو گیا۔ اس طرح اس نے سوئچ بند نہ کر کے بجلی سے چلنے والی کئی چیزیں خراب کر دی تھیں۔

عید آنے والی تھی، چاند رات کی بات ہے کہ ماریہ نے اپنے کپڑے استری کر لیے تو حسب معمول سوئچ آف نہیں کیا۔ زیادہ وقت گزرا تو استری گرم ہو گئی۔ بعد میں عائشہ اپنے عید کے کپڑے استری کرنے آئی تو اس نے گرم استری کپڑوں پر رکھ دی۔ پھر کیا تھا، اس کا عید کا نیا جوڑا جل گیا۔ یہ دیکھ کر عائشہ رونے لگی۔ ماریہ کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے عائشہ سے معافی مانگی۔ اسی وقت کمرے میں ابو آ گئے۔ انھوں نے دونوں بیٹیوں کی باتیں سن لی تھیں۔ ابو نے ماریہ سے کہا: "بیٹا! اب عائشہ سے معافی مانگنے سے کچھ نہیں ہو گا، بلکہ تمھیں اپنی یہ خراب عادت بدلنی ہو گی۔ ہمارے ملک میں کتنے ہی دیہات ایسے ہیں جہاں بجلی نہیں۔ اگر ہم بجلی کی بچت کریں گے تو ہر گاؤں کو بھی بجلی میسر آ سکتی ہے۔ پاکستان کی تمام فیکٹریاں اور کارخانے بجلی ہی سے چلتے ہیں اور آج کل بجلی نہ ہونے کی وجہ سے گھنٹوں کام بند رہتا ہے جس سے مہنگائی بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اگر ہم بجلی بچائیں گے تو نہ صرف بل کم آئے گا بلکہ مہنگائی میں بھی کمی ہو گی۔"

یہ سن کر ماریہ بہت شرمندہ ہوئی۔ اس نے عائشہ اور ابو سے معافی مانگی اور عہد کیا کہ وہ آئندہ کبھی بجلی ضائع نہیں کرے گی، بلکہ اس نعمت کی قدر کرے گی۔ ■

میں بھکاری تھا

حافظ نعیم احمد سیال۔ ملتان

"ابھی تک کٹورا پکڑے بیٹھا ہے!" میں پانی کے ساتھ سوکھی روٹی کھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ابا نے چیخ کر میری کمر پر لات ماری تو میں کٹورا اٹھا کر باہر بھاگا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ابا مجھ سے بھیک منگواتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے معذور تھا اور مجھ سے بھیک منگواتا تھا۔ مجھے یہ کام پسند نہیں تھا، مگر ابا کی گالیوں اور لاتوں سے بچنے کے لیے یہ کام کرتا تھا۔

میں کٹورا ہاتھ میں پکڑے چلا جا رہا تھا کہ میری نظر ایک پرانے سے اسکول پر پڑی۔ میں اندر چلا گیا جہاں بہت سے بچے پڑھ رہے تھے۔ میں ماسٹر صاحب کے پاس گیا اور حسبِ عادت کٹورا ان کے آگے کر دیا۔

ماسٹر صاحب بولے: "بھیک مانگتے ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا تو وہ بولے: "تمہیں بھیک تو ملے گی، مگر علم کی بھیک لو گے کیا؟" ماسٹر صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

"علم کی بھیک کا میں کیا کروں گا؟" میں نے دکھی لہجے میں کہا: "ابا دونوں ہاتھوں سے معذور ہے۔ اماں گھر سنبھالتی ہے، اگر میں بھیک نہ مانگوں تو گھر کیسے چلے؟"

"مگر میں تو تمہیں علم کی ہی بھیک دے سکتا ہوں، لینی ہو تو روز آ جایا کرو۔" ماسٹر صاحب نے کہا تو میں واپس چل دیا۔

مجھے علم حاصل کرنے کا شوق تو تھا، مگر ابا کی اجازت نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں دن رات لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا رہوں۔ شام تک میرا کٹورا بھر گیا تو میں گھر چلا گیا اور کٹورا ابا کے سامنے رکھ دیا۔ ابا خوش ہو گیا۔ جب میں سونے کے لیے لیٹا تو نیند نہ آئی۔ ماسٹر صاحب کے الفاظ میرے دماغ میں گونج رہے تھے۔ اگر مجھے علم کی بھیک ملتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

اگلے دن میں نے کٹورا پکڑا اور باہر نکل آیا۔ تھوڑی دور جا کر میں نے کٹورا پھینکا اور اسکول پہنچا جہاں ماسٹر صاحب بچوں کو پڑھا رہے تھے۔

"کیا آج پھر بھیک لینے آئے ہو؟" ماسٹر صاحب نے پوچھا تو میں نے کہا: "ہاں، مگر علم کی بھیک لینے آیا ہوں۔ اگر آپ مجھے سہارا دیں گے تو میں بھی پڑھ لوں گا۔" کہتے کہتے میں رونے لگا۔

ماسٹر صاحب نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے گھر لے گئے جو اسکول کی دیوار کے ساتھ تھا جہاں ان کی بیوی اور بیٹا بھی رہتا تھا جو میری ہی عمر کا تھا۔ انہوں نے مجھے صاف لباس بھی دیا اور کھانا بھی کھلایا اور میں اسکول میں پڑھنے لگا۔

مجھے پڑھنے میں اتنا مزہ آنے لگا کہ پتا ہی نہ چلا کہ وقت کیسے گزر گیا۔ ضرورت کی ہر چیز مجھے مل جاتی تھی۔ میرے ذمے ماسٹر صاحب نے اسکول کی صفائی کا کام لگا دیا جو میں خوشی سے کرتا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور میں نے اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر لیا۔ پھر میرا داخلہ شہر کے بڑے کالج میں ہو گیا جہاں میری فیس معاف کر دی گئی۔ میں دل لگا کر پڑھتا رہا۔ ایف ایس سی میں پہلی پوزیشن آئی تو میں نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میں نے وہاں بھی خوب محنت کی۔ اسی طرح چار سال گزر گئے۔ پھر وہ دن آ گیا جب مجھے انجینئرنگ کی ڈگری ملی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اتنی آسانی سے کامیابی مل جائے گی۔

میں سیدھا ماسٹر صاحب کے گھر پہنچا۔ ان کا بیٹا مجھے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ اسی وقت ماسٹر صاحب بھی آ گئے۔ میں ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور روتے ہوئے کہا: "ماسٹر صاحب میں وہی بھکاری ہوں جسے آپ نے اس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ اگر آپ مجھے علم کی بھیک نہ دیتے تو نجانے میں کہاں ہوتا۔"

ماسٹر صاحب نے مجھے اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا: "بیٹا! یہ میرا فرض تھا جو میں نے پورا کر دیا ہے، مگر اب تمہارا یہ فرض ہے کہ تم علم کی اس دولت کو ان لوگوں میں بانٹو جو اس سے محروم ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تمہارے باپ کا انتقال ہو چکا ہے اور تمہاری ماں اب میرے گھر میں رہتی ہیں اور گھر کی صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد میری ملاقات اپنی ماں سے ہوئی تو میں خوش ہو گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے میرے سب دکھ دور کر دیے تھے۔ n

مرغا مرغی زندہ باد!

مار یہ نوید۔ فیصل آباد

ثانیہ اور زرینہ دو بہنیں تھیں۔ ان کے پڑوسیوں نے مرغ اور مرغیاں پالی تھیں۔ دونوں چھت پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں اور مرغ میاں چھت پر ٹہل رہے تھے۔ لگ رہا تھا جیسے وہ غصے میں ہیں اور مرغی کی پٹائی کرنا چاہتے ہیں۔ بیگم مرغی نے ان کے تیور دیکھے تو تیار ہو گئیں، جیسے ہی مرغ نے نیچے چھلانگ لگائی، مرغی بیگم پھڑ پھڑاتی ہوئی چھت کی منڈیر پر آ بیٹھیں اور ککڑوں کوں کرنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں: ”میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں۔“ اب تو مرغ میاں زور زور سے ککڑوں کوں کرتے ہوئے بولے: ”میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ تم مجھے بغیر بتائے کہاں چلی گئیں؟“

یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنا ایک پنجا اٹھایا جیسے مرغی بیگم کو دھمکا رہے ہوں: ”دیکھو! اب میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں؟“

اسی وقت پیچھے سے دو ننھے منے بچے آ گئے تو مرغ میاں کچھ نہ کہہ سکے۔ یہ تماشا کافی دیر تک جاری رہا۔

دونوں بہنیں یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ آخر ثانیہ بولی: ”زرینہ! تم نے دیکھا کہ جانوروں کو بھی اپنے بچوں سے کس قدر پیار ہے۔“

”ہاں، واقعی لیکن میں نے ایک بات نوٹ کی ہے۔“ زرینہ نے کہا: ”وہ یہ کہ جب مرغ اپنی مرغی کو ڈھونڈ رہا تھا تو ایسا لگا جیسے وہ دونوں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ جانوروں کا بھی دل کھیلنے کو چاہتا ہے۔“

ثانیہ بولی: ”مجھے لگتا ہے جیسے ان میں لڑائی ہو گئی تھی، مگر ان دونوں کے درمیان پیار کا اچھا رشتہ قائم ہے۔ آخر وہ ایک گاڑی کے دو پہیے جو ہیں۔“

”مرغا مرغی زندہ باد!“ دونوں بہنوں نے ایک ساتھ کہا اور ہنستی ہوئی چلی گئیں۔n

نورین اور نادیہ

خدیجہ نور، اقصیٰ پروین (کمالیہ)

ایک گاؤں میں دو بہنیں نادیہ اور نورین رہتی تھیں۔نورین بڑی اور نادیہ چھوٹی تھی۔نورین نے پڑھائی مکمل کر لی تھی، مگر نادیہ ابھی پڑھ رہی تھی، اس لیے وہ اپنی چھوٹی بہن کی پڑھائی میں مدد کرتی تھی۔دونوں بہنیں بہت پیار سے رہتی تھیں، لیکن گاؤں کی لڑکیاں ان کے پیار سے جلتی تھیں، کیوں کہ ان کا پیار ہی ان کی طاقت تھا۔وہ انہیں ہر حال میں علیحدہ کرنا چاہتی تھیں۔ایک روز گاؤں کی لڑکیوں نے ایک منصوبہ بنایا اور ایک لڑکی فریحہ کو ان کے گھر بھیجا۔اس لڑکی نے دونوں بہنوں سے کہا:

"میرا کوئی گھر نہیں ہے، مجھے پناہ دے دو۔"

نورین اور نادیہ نے فریحہ کو اپنے ماں باپ کی اجازت سے اپنے گھر میں رکھ لیا اور اپنی بہنوں کی طرح سمجھنے لگیں، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ ان کی دشمن ہے۔فریحہ نے نادیہ سے کہا:

"تمہاری بڑی بہن نورین تم سے پیار نہیں کرتی۔"

پہلے تو نادیہ نے فریحہ باتوں کو نظرانداز کیا، لیکن جب وہ مسلسل نورین کے خلاف باتیں کرتی رہی تو نادیہ کے دل میں اپنی بہن کے لیے برائی پیدا ہونے لگی۔

ایک دن نادیہ نے نورین سے کہا: "کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں؟"

اس پر نورین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، لیکن وہ ذرا بھی نہ سمجھی۔رفتہ رفتہ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی گئیں۔ایک دن جب نادیہ فریحہ کا کھانا لے کر گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ کسی سے بات کر رہی ہے۔نادیہ وہیں کھڑی رہی اور اس کی ساری باتیں سن لیں، پھر اس نے نورین کو جاکر ساری بات بتادی کہ فریحہ ایک سازش کے تحت ان کے گھر میں رہ رہی ہے جس کے بعد نورین نے فریحہ کو گھر سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔جب فریحہ نے دیکھا کہ اس کا راز کھل گیا ہے تو وہ بولی: "یہ سب گاؤں والوں کی چال ہے۔وہ تم دونوں بہنوں کے پیار سے جلتے ہیں اور تمہیں علیحدہ کرنے کے لیے ہی انہوں نے مجھے یہاں بھیجا تھا، مجھے معاف کر دو۔"

جب اصل بات سامنے آگئی تو نورین نے فریحہ کو معاف کر دیا۔اس کے بعد گاؤں والے ان کے گھر پر آئے اور ان سے معافی مانگی۔دونوں بہنوں نے سب کو معاف کر دیا اور سب خوشی خوشی رہنے لگے۔

ناناجان کا اسکول

فیصل عثمان حیدر۔ رحیم یار خان

ناناجان کو ذرا سا بخار چڑھتا تو اپنے درجنوں نواسوں، نواسیوں، پوتوں اور پوتیوں کو اکٹھا کر لیتے اور ان سے کہتے:

"بچو! بچیو! میں اس گاؤں میں مرنے سے پہلے اسکول اور کالج کھولنا چاہتا ہوں۔"

ان نواسہ شرجیل جلدی سے کہا: "یہ تو اچھی بات ہے، جلدی سے بنوا دیں ناں۔"

"بیٹا! میرا بخار ہلکا ہو جائے تو چوہدری اللہ دتہ کو فون کرنا ہے کہ تھوڑا بہت سامان بھجوا دو، تاکہ میں اسکول کا سنگ بنیاد تو رکھ دوں۔" ناناجان فوراً جواب دیتے۔

لیکن بخار کم ہونے کے بعد وہ کورٹ کچہری کے کاموں میں الجھ کر رہ جاتے یا پھر پرانے دوستوں کی دعوتیں کرنے لگتے اور اسکول کالج کا خواب بھول جاتے۔ جوں ہی گھٹنوں یا ٹخنوں میں ہلکا سا ورم آ جاتا تو ان بچوں کو دوبارہ بلواتے اور کہتے: "بھئی بس اب میں یہ کام شروع کرنے والا ہوں۔"

ایسے میں ان کی لاڈلی نواسی کہتی: "ناناجان! آپ گاؤں میں اسکول کالج بنانے کے لیے تیار تو ہیں، مگر یہ بتایئے کہ شہر سے یہاں پڑھانے کون سی ٹیچر صاحبہ آئیں گی۔"

وہ جلدی سے کہتے: "ہمیں کیا ضرورت ہے باہر سے ٹیچرز بھرتی کرنے کی؟ ماشاءاللہ میرے درجنوں نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں کس لیے ہیں؟ مجھے انھی سے کام لینا ہے۔ میں انھیں گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو پڑھاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے یہ سب بچے تعلیم یافتہ ہیں، کیا یہ خالی زمین داری ہی کرتے رہیں گے؟ ان کی پڑھائی کا اصل فائدہ اسی وقت ہوگا جب یہ اپنی تعلیم اس گاؤں کے بچوں کو منتقل کریں گے۔"

ایک روز یہی بات ہو رہی تھی کہ ان کے نواسے صائم نے کہا: "ناناجان! میں نے انگریزی میں ایم اے یہاں کے جاہل اور گنوار بچوں کے لیے نہیں کیا، میں تو شہر کے کسی اعلیٰ کالج میں پڑھاؤں گا۔"

صائم کی بات سن کر ناناجان غصے سے بولے: "تمہارے خیالات تو ابھی سے باغیانہ لگتے ہیں۔ کہاں ہے بلقیس، تیری ماں؟ اس سے پوچھتا ہوں کہ تیرے لاڈلے نے اگر سولہ جماعتیں پڑھ لیں تو ہمیں اس کا کیا فائدہ پہنچا؟ چلو کان پکڑو۔" ناناجان نے مصنوعی غصے سے کہا تو صائم نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اچھا ناناجان مہربانی کر کے آپ سنگ بنیاد تو رکھیں اسکول کا میں آپ کے قائم کردہ اسکول میں ہی پڑھاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، آج اور اسی وقت اللہ دتہ بھٹے والے کا نمبر ملا کر میری بات کراؤ اور اس سے کہو کہ کچھ سامان بھجوائے۔ لیکن سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں، میں اپنے شہر کے دوستوں کو بھی گاؤں بلواؤں گا۔ ارے یاد آیا، آج تو میری 100 ویں سالگرہ ہے پہلے کیک کا اہتمام ہو جائے۔ چلو شہر سے اچھا اور بڑا سا کیک لاتے ہیں۔"

"ناناجان کیک ہم سب مل کر تیار کر لیں گے۔" لڑکوں نے کہا تو درمیان میں شازیہ نے لقمہ دیا: "پہلے اللہ دتہ کو فون کر لیں۔"

"اچھا، اچھا تم نمبر ملاؤ اور اللہ دتہ سے میری بات کراؤ۔" ناناجان نے حکم دیا۔

اسی دوران کاشف، سلمان اور جنید ایک بڑا سا کیک لے کر اندر داخل ہوئے تو ناناجان نے کہا: "ارے واہ! اتنی جلدی کیک تیار کیسے ہو گیا؟"

"ہم آپ کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ آپ کیک کاٹیے۔" سب نے کہا۔

ناناجان نے کیک کاٹنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ان کا ہاتھ گر گیا۔ ناناجان کی نبض رک چکی تھی۔ وہ دنیا سے جا چکے تھے۔

فاتحہ خوانی کے بعد تمام بچوں نے ڈھیروں مہمانوں کی موجودگی میں ناناجان کی منتخب کی ہوئی زمین پہ اسکول کا سنگ بنیاد رکھا اور یہ دعا کی: "ہم ناناجان کا خواب، مشن اور خواہش پوری کر کے رہیں گے اور یہاں اس اسکول کے علاوہ ایک کالج بھی قائم کریں گے جہاں اپنے گاؤں اور ساتھ والے دوسرے دیہات کے بچے اور بچیاں تعلیم حاصل کریں گے۔ ہم ناناجان کا خواب پورا کر کے رہیں گے۔" n

ننھا ہدہد

حنا سید۔ شہداد پور

یمنیٰ سب بچوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک زخمی چڑیا پر پڑی۔ وہ اس چڑیا کو اٹھا کر گھر لے آئی اور اسے اپنی بڑی بہن سدرہ کو لے جا کر دکھایا۔ سدرہ نے اس چڑیا کو دیکھا تو اسے اس پر بہت رحم آیا، کیوں کہ اس کا زخمی تھا جسے دیکھ کر تو ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کسی بچے نے پتھر مارا ہو۔ بہر حال سدرہ اور یمنیٰ نے مل کر چڑیا کی دیکھ بھال کی، مگر بعد میں انھیں پتا چلا کہ یہ کوئی چڑیا کا بچہ نہیں بلکہ ہدہد کا بچہ ہے۔ اس کے سر پہ تاج تھا ۔ سدرہ نے اس کے پر کے اوپر مرہم لگایا، مگر زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ کچھ کھا پی نہیں رہا تھا۔ یمنیٰ کے بھائی نے اسے بتایا: ”ہدہد وہ کیڑے مکوڑے اور لکڑی کھاتا ہے۔“

یہ جان کر یمنیٰ اور سدرہ کو بڑا دکھ ہوا، کیوں کہ اب وہ اسے گھر پہ نہیں رکھ سکتی تھیں۔ ان دونوں نے سوچا کہ وہ اس کے صحیح ہوتے ہی اسے اڑا دیں گی۔ ہدہد کا بچہ اڑنا چاہ رہا تھا۔ دو دن تک اس نے پانی پہ گزارا کیا، مگر وہ زندہ نہ رہ سکا، کیوں کہ اس کی تکلیف دور نہیں ہو رہی تھی اور اگلے دن وہ مر گیا۔

دوستو! ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہماری ایک چھوٹی سی غلطی سے کوئی بھی جاندار مشکل میں پڑ سکتا ہے یا اس کی زندگی کو کوئی خطرہ ہو سکتا ہے اور ہمیں اپنے سے چھوٹوں کو بھی اس بارے میں بتانا چاہیے۔

مگر یمنیٰ اور سدرہ کو ایک بات کی خوشی بھی تھی کہ ہدہد کے بچے کی دیکھ بھال انھوں نے پوری ذمے داری سے کی تھی اور انھیں امید تھی اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہو گا۔n

گلدانا کی لوک کہانی

نیا ہیرو

مریم فاطمہ ۔ کراچی

ایک روز طوفانی ہوا کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے سورج کو بڑے غرور سے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”میں تم سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوں، میں جب چاہوں، موسم بدل سکتی ہوں، میرے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میں ذرا سی دیر میں سردی کو گرمی میں بدل سکتی ہوں اور گرمی کی جگہ سردی کا راج قائم کر سکتی ہوں۔“

طوفانی ہوا کی شیخی سن کر سورج بولا: ”دنیا کا ہر موسم اپنی اپنی جگہ اہم بھی ہے، طاقت ور بھی اور اپنے منفرد اثرات بھی رکھتا ہے۔“

لیکن ہوا نے ہٹ دھرمی سے کہا: ”میں تمہاری بات نہیں مانتی۔

تمام موسم طاقت ور ہیں، لیکن میں ان میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ میرے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو آجاؤ، مجھ سے مقابلہ کر لو۔ میں ثابت کر دوں گی کہ میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوں۔

“

سورج کو بھی تاؤ آ گیا۔ اس نے ہوا کا چیلنج قبول کر لیا اور طے ہوا کہ پہلے ہوا اپنی طاقت دکھائے گی۔ چناں چہ ہوا نے چلنا شروع کر دیا۔ پہلے تو وہ بڑی سبک رفتاری سے چلتی رہی، پھر ایک دم طوفان میں بدل گئی جس سے گھبرا کر لوگ اپنے آپ کو اور اپنی چیزوں کو سنبھالنے لگے، وہ ہر چیز کو اڑائے دے رہی تھی۔ چند منٹ میں ہی تیز ہوا نے ہر طرف افرا تفری مچا دی۔ نہ جانے کتنے لوگوں کا نقصان ہوا۔ کچے گھروں اور جھونپڑیوں کی چھتیں اڑ گئیں۔ ہر طرف کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگ گیا۔

اب سورج کی باری تھی۔ اس نے نیلے چمک دار آسمان میں پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنا شروع کیا تو زمین بھی گرم ہو گئی اور لوگ گھبرا گئے۔ وہ سائے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، دھوپ کی تپش نے ان کے ہوش اڑا دیے تھے۔ گھروں سے باہر موجود لوگ گرمی سے بچنے کے لیے واپس گھروں میں گھس گئے۔

ہوا نے جب سورج کی وجہ سے لوگوں کو پریشان دیکھا تو اسے غصہ آ گیا اور اس نے پوری رفتار سے چلنا شروع کر دیا جس سے دھوپ کی شدت کم ہو گئی اور لوگوں نے سکون کا سانس لیا، مگر اب طوفانی ہوا ان کے لیے پریشانیاں پیدا کر رہی تھی۔ مقابلہ ختم ہو گیا اور سورج اس کا فاتح رہا۔ مگر یہ فیصلہ ہوا برداشت نہ کر سکی۔ اسی دوران بارش، سیاہ بادلوں اور سارے ہی موسم نے سورج کی جیت پر خوب تالیاں بجائیں اور اسے نیا ہیرو قرار دیا۔

لیکن سورج فوراً بولا: ”آپ سب لوگ تالیاں بجانا بند کریں، کیوں کہ میں اس مقابلے کا فاتح نہیں ہوں۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں، نہ کوئی کسی سے بڑھ کر ہے اور نہ کم تر۔ موسموں کو بدلنے میں ہر ایک کا اپنا اپنا اہم کردار ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے ٹیم ورک سے ہی موسم بنتے اور بدلتے ہیں۔ ہم سب لوگ اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ بادل اور بارش زمین کو پانی دیتے ہیں۔ ہوا بادلوں کو دنیا کے ہر کونے تک پہنچاتی ہے۔ ہم دنیا کے لوگوں کو روشنی بھی دیتے ہیں اور سایہ بھی۔ ہماری مشترکہ محنت سے پھل پھول، پیڑ پودے اور درخت اگتے ہیں، ہماری فصلیں پک کر تیار ہوتی ہیں۔ ہماری اجتماعی محنت سے اہلِ دنیا کو خوراک ملتی ہے، مجھے خوشی ہے کہ اس سارے کام میں ہوا کا بھی اہم کردار ہے اور میں اسے اس کے کردار پر سلام پیش کرتا ہوں۔ ہوا کے بغیر ہماری ٹیم نامکمل ہے۔“

ہوا کی سمجھ میں اب پوری بات آ چکی تھی۔ اسے اپنے تمام ساتھیوں کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ اس کے تمام ساتھی اس کے لیے کتنے ضروری ہیں اور یہ سب مل کر ہی سردی، گرم، بہار، خزاں اور برسات لاتے ہیں۔n

پیڑ کو کاٹنے کا منصوبہ

محمد عثمان جامعی

محلّہ گلستان میں لگا برگد کا وہ درخت اس محلے بھی نہ جانے کتنا پرانا تھا۔ اس کی چھاؤں کے گھیرے میں ننھے منے بچے کھیلتے، نوجوان اس کے تنے کو وکٹ بنا کر کرکٹ کھیلتے اور بزرگ اس کے سائے تلے بیٹھے دن دن بھر باتیں کرتے رہتے۔ کبھی کوئی آوارہ کتا اس کی چھاؤں میں آکر سو جاتا تو کبھی کوئی فقیر اس کے تنے سے کمر لگا کر آرام کرتا دکھائی دیتا۔ یہ درخت اس بستی کا ایک فرد بن گیا تھا۔ ایک دن سب نے سنا کہ "بڑے صاحب" اس پیڑ کو کاٹ ڈالنے پر تلے ہیں۔

ان کا نام تو کچھ اور تھا، مگر وہ خود کو بڑے صاحب کہلانا پسند کرتے تھے، بس اس لیے کہ ان کے پاس بہت سارا پیسہ تھا، حالاں کہ اس محلے کے صحیح معنوں میں بڑے لوگ تو دوسرے تھے، جیسے ماسٹر رحیم الدین، جو بچوں کو مفت ٹیوشن پڑھاتے تھے، انور فراغ جو اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کو اچھی باتوں کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے تھے یا زبیدہ خاتون جو کسی کے کام آنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ خیر بڑے صاحب کا اس محلے کے آخر میں سڑک کے اس پار بڑا سا بنگلہ تھا۔ ان کا اس بستی سے بس اتنا تعلق تھا کہ وہ مرکزی سڑک تک جانے کے لیے اس محلے کی گلیوں سے گزرتے تھے، اور برگد والی گلی ان کے لیے سڑک تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ تھی۔
اب ہوتا یہ تھا کہ گاڑی کو برگد اور اس کے ارد گرد بیٹھے لوگوں کو گاڑی سے بچانے کے لیے بڑے صاحب اور ان کے اہل خانہ کو گاڑی کی رفتار کم کرنا پڑتی تھی، جو انھیں ناگوار گزرتا تھا۔ چناں چہ ایک دن انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس درخت کو کاٹ کر اپنی گاڑی کے لیے راستہ بنا لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے ملازم ایسے وقت بھیجے جب برگد کے ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ ابھی وہ اپنی بوڑھے برگد پر وار کرنے کے لیے اپنی کلہاڑیاں تول ہی رہے تھے کہ کچھ بچوں نے انھیں دیکھ لیا اور "ہمارا پیڑ مت کاٹو" کا شور مچا دیا۔ بچوں کی آواز پر دوسرے بچے بھی جمع ہو گئے اور بڑے صاحب کے لوگوں کے ان کے ارادے پر عمل سے روک دیا۔

....

چوک نے کو پوری رفتار سے بھاگتے آتا دیکھ کر پھرتی اور اس کی کمر پر بیٹھے ہریالا سمجھ گئے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔
"کیا ہوا؟" چوکنے کے پہنچتے ہی پھرتی نے پوچھا۔
"وہ دیکھ رہی ہو، برگ کے سامنے لگا تمبو" چوکنے نے اپنے منہ سے برگد کی طرف اشارہ کیا۔
"ہاں، وہ تو بڑے صاحب کے ملازم کے بیٹے کی سال گرہ ہے، جو بڑے صاحب دھوم دھام سے منا رہے ہیں۔" ہریالا پھرتی کی کمر سے پھدک کر اترتے ہوئے بولا۔
"یہ ایک سازش ہے۔ جب مجھے اس تقریب کا پتا چلا تو میں نے سوچا یہ تقریب بڑے صاحب کے گھر سے اتنی دور برگد کے قریب کیوں ہو رہی ہے۔ یہ سوچتے ہی میں حقیقت جاننے کے مشن پر روانہ ہو گیا۔ بڑے صاحب کے بڑے سے پالتو کتے سے میری بہت اچھی دوستی ہے۔ میں اس سے ملا اور باتوں باتوں میں اصل معاملہ جاننے کی کوشش کی۔ پتا ہے اس نے کیا بتایا؟"
"کیا؟" دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔
"وہ کہنے لگا کہ بڑے صاحب نے منصوبہ بنایا ہے کہ سال گرہ کی آڑ میں رات دیر تک تقریب ہو گی اور زوردار آواز میں ریکارڈنگ ہوتی رہے گی۔ اس دوران بڑے صاحب کے آدمی تمبو کے پیچھے اپنا کام جاری رکھیں گے، یعنی وہ الیکٹرونک آری سے برگد کو کاٹتے رہیں گے اور چند گھنٹوں میں پیڑ کو گرا دیں گے۔ صبح اپنا برگد گرا دیکھ کر محلے والے شور مچاتے ہیں تو مچاتے رہیں، اب وہ فوری طور پر نیا پیڑ تو لگانے سے رہے۔ آخر کار چپ ہو کر بیٹھ جائیں گے۔"
"اوooooo تو... یہ چکر ہے!" ہریالے نے اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں۔
"مگر ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔" پھرتی نے پورے عزم کے ساتھ دونوں اگلے پنجوں پر کھڑے ہو کر کہا۔
"تو کیا کرنا ہے؟" چوکنے نے پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی تینوں سوچ بچار میں ڈوب گئے۔

.....

رات کے بارہ بجنے کو تھے مگر سال گرہ کی تقریب جاری تھی۔ محلے سے کسی کو بلایا ہی نہیں گیا تھا، اس لیے کسی کو کیا پتا کہ تمبو کے اندر نہ کوئی کیک ہے، نہ غبارے، بس کچھ لوگ بیٹھے محلے والوں کے سونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب انھیں یقین ہو گیا تو وہ ان میں سے تین افراد اپنے ہاتھوں میں بڑی بڑی الیکٹرونک آریاں لے کر نکلے اور برگد کے پاس جا پہنچے۔
"چل بھئی شروع کر خیرو!" ان تینوں میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ خیرو نے آری نکال کر "گھرررر" کی آواز کے ساتھ اسے اسٹارٹ کیا اور درخت کی طرف بڑھا ہی تھا کہ نہ جانے کہاں سے ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور اس نے اپنی چونچ سے خیرو کی ناک پر اس زور سے کاٹا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ ابھی خیرو کے ساتھی نے اسے دیکھ کر "کیا ہوا" کہا ہی تھا کہ ایک نرم سی چھوٹی سی بلا نے اچھل کر اس کے منہ پر اپنے دونوں پنجے یوں مارے کہ وہ ہائے ہائے کرتا اپنا منہ سہلاتا بھاگ کھڑا ہوا۔ ان کا تیسرا ساتھی صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس پر بھی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ کسی نے اپنے دانتوں سے یوں اس کی قمیص کو کھینچا کہ وہ کمر کے بل گر پڑا اور اس دوڑتی ہوئی چیز کے ساتھ دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ وہ تینوں چیختے ہوئے دوڑے اور برگد کے سامنے والی گلی میں دوڑتے چلے گئے۔ ان کی چیخوں میں ریکارڈنگ کا شور بھی دب گیا۔ آسمان کو چھوتی چیخیں سُن کر سارا محلّہ جاگ اٹھا۔ جستجو ہوئی کہ ماجرا کیا ہے۔ اسی اثناء میں محلے والوں نے دیکھا کہ تمبو کے پاس چوکنا کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا اور دُم ہلا رہا ہے۔ اس کی پیٹھ پر ہریالا بیٹھا ہے اور پھرتی بی بی دو پنجوں کے بل وہیں بیٹھی ہیں۔ چوکنا لوگوں کو دیکھ کر دھیرے سے بھونکا اور پھر وہ تینوں تمبو کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے برگد تک پہنچ گئے۔ محلے والوں کی توجہ ان پر مرکوز ہو چکی تھی۔ وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے آگئے۔ پیڑ کے پاس پہنچ کر دیکھا تو الیکٹرونک آریاں پڑی نظر آئیں۔ تمبو میں جھانکا تو وہاں کوئی نہیں تھا، ایک کونے میں رکھے ٹیپ ریکارڈر پر اونچی آواز میں گانے بج رہے تھے۔ سب جان گئے کہ قصہ کیا ہے۔

....

اگلی صبح محلے والوں نے دیکھا کہ برگد کی شاخیں تیز ہوا میں یوں جھول رہی تھیں جیسے خوشی سے جھوم رہی ہوں، ہریالا، پھرتی اور چوکنا پیڑ کے سائے تلے آرام کر رہے تھے اور بڑے صاحب کی گاڑی برگد کے پیڑ سے دور دور لمبا چکر کاٹ کر سڑک کی طرف جا رہی تھی۔
(تینوں دوستوں کی بہادری کی اگلی کہانی اگلے ہفتے پیش کی جائے گی)n

پتنگ بازی

میں تیزی سے گھر میں داخل ہوئی تو اپنے چھوٹے بھائی فراز سے ٹکرا کر فرش پر گر گئی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا، مگر جب فراز نے رونا شروع کیا تو میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی، مگر وہ روتا رہا۔ لیکن جب میں نے اسے چاکلیٹ کا لالچ دیا تو اس کی آواز بند ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں گھستے ہی میں نے اپنا پرس کندھے سے اتار کر اوپر اچھالا تو وہ حنا آپی کے اوپر گرا جو اپنے کپڑے پریس کر رہی تھیں۔ انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا اور کچھ کہنا چاہا تو میں اخبار اٹھا کر پڑھنے بیٹھ گئی اور آپی سر ہلا کر رہ گئیں۔

"اوہ میرے خدا!" میں نے کہا تو حنا آپی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ گاؤں کا ایک لڑکا گلے پر پتنگ کی ڈور پھرنے کے باعث مر گیا۔ حنا آپی نے افسردگی کا اظہار کیا اور ایک بار پھر اپنے کام میں لگ گئیں۔

"آپی! مجھے پتنگ بازی ہمیشہ سے بری لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، تمھیں یاد ہے کئی سال پہلے ہمارے سامنے والوں کا بچہ ساجد پتنگ اڑاتے ہوئے چھت سے گر گیا تھا اور کئی ماہ تک اس کے بازو پر پلاسٹر چڑھا رہا تھا۔"

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا: "آپی! ہمارے ہاں موسم بہار بسنت کا پیامبر بن کر آتا ہے، مگر نہ جانے کتنے معصوموں کی جانیں لے لیتا ہے۔ ہم بسنت اس طرح مناتے ہیں کہ عید بھی اس کے آگے پھیکی پڑ جاتی ہے۔ کوئی ہے جو ہمیں اس خرافات سے بچائے؟"

آپی نے میری بات سن کر کہا: "پتنگ بنانے والوں کو چاہیے کہ وہ یہ کام چھوڑ دیں۔ دکاندار انہیں بیچنے سے انکار کر دیں اور والدین اپنے بچوں کو پتنگ خریدنے کے لیے پیسے نہ دیں، اس کے بجائے انھیں مطالعے کے لیے اسلامی کتب خرید کر دیں۔ ہمیں خود بھی اپنے طور پر لوگوں کو اس برائی سے روکنا چاہیے۔" آپی تو یہ کہہ کر چل دیں، لیکن میں سوچ رہی تھی کہ اپنی قوم کو فضول اور فرسودہ رسومات سے بچانے کی کوشش ضرور کروں گی۔ آپ اس مہم میں میرا ساتھ دیں گے ناں؟ n

پہلا سوال

اسماء انصاری۔ ٹانگو والی

ایک بار یا دو بار نہیں، بلکہ پورے تین بار اس نے سوال پڑھ ڈالا۔ سوال سمجھ میں آنا تھا نہ آیا۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ سوال سمجھنے میں ناکام رہا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سوال پیپر میں آ کہاں سے گیا۔ شاید اس سوال کو تو اس نے کتاب میں کہیں بھی نہیں دیکھا۔ پہلا سوال پندرہ نمبر کا تھا اور لازمی تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور وہ پریشان تھا۔ سر اٹھا کے اس نے ہال میں ادھر ادھر دیکھا۔ سب بچے اپنا اپنا پیپر بڑے اطمینان سے کر رہے تھے۔ مگر اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ایک دو بار اس نے آگے بیٹھے دوست سے مدد لینے کے لیے اسے آواز دی، لیکن اس نے بھی لفٹ نہیں کرائی۔ وہ نڈھال ہو رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ نے اس سے پرچہ لے لیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہ نکلے۔

”ارے تم خواب میں رو رہے ہو!“ یہ آواز سن کر وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس کے پاس امی بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ وہاں نہ تو کمرۂ امتحان تھا اور نہ پریشان کرنے والا سوال۔

دوسرے روز کی بات ہے کہ اسلامیات کا پیریڈ چل رہا تھا۔ استاد آخرت کی زندگی پہ لیکچر دے رہے تھے۔ انہوں نے اچانک پوچھ لیا: ”آپ میں سے نماز کون کون پڑھتا ہے؟“

تقریباً پوری کلاس نے ہاتھ کھڑا کیا، سوائے منان کے۔

”بچو! آپ کو معلوم ہے کہ روز قیامت سب سے پہلے نماز کے بارے میں سوال ہوگا اور جو پہلے ہی سوال میں اٹک گیا، اس کا انجام دوزخ کی تپتی آگ ہوگی۔ روز قیامت سب کو اپنی اپنی فکر ہوگی، کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ سب اپنے کیے کی سزا یا جزا پائیں گے۔ اس دن ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار، دوست سب ساتھ چھوڑ دیں گے۔“

استاد بولتے جا رہے تھے اور منان کسی اور دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ رات والا خواب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے اسی لمحے خود سے یہ عہد کیا: ”آئندہ کبھی نماز نہیں چھوڑوں گا، کیوں کہ وقت ابھی میرے ہاتھ میں ہے۔“ n

پھل والی شہزادی

رابعہ اعظم۔ لاہور

کسی ملک پر ایک رحم دل بادشاہ حکومت کرتا تھا، لیکن اس کی ملکہ بہت مغرور تھی۔ اس کے پاس ایک جادوئی آئینہ تھا جس سے ملکہ پوچھتی رہتی کہ دنیا میں سب سے خوب صورت عورت کون ہے تو آئینہ جواب دیتا: ”تم۔“

اسی ملک کے ایک گاؤں میں ایک کسان اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن کسان کہیں سے ایک پودا لایا جس پر چند روز بعد پھل لگنے لگے۔ ان میں ایک پھل کافی بڑا تھا۔

ایک روز کسان کے گھر کھانے کو کچھ نہ تھا تو کسان نے اپنی بیوی سے کہا: ”آج یہ پھل کھا لیتے ہیں۔“

کسان کی بیوی نے بڑا پھل توڑ کر اس کا چھلکا اتارا تو اس میں سے ایک چھوٹی سی لڑکی نکلی۔ باہر آتے ہی وہ لمبی ہو گئی۔

اس نے بتایا کہ ایک جن نے اسے اس پھل میں قید کر دیا تھا۔ کسان اور اس کی بیوی حیران بھی تھے اور خوش بھی۔ انہوں نے لڑکی کا نام شہزادی شاہ نور رکھا۔ جب سے شاہ نور پیدا ہوئی تھی، جادوئی آئینہ کہنے لگا تھا: ”دنیا میں سب سے خوب صورت شہزادی شاہ نور ہے۔“

یہ سن کر ملکہ کو غصہ آگیا اور ایک روز وہ جادوئی آئینے کے ذریعے شاہ نور کے گھر پہنچ گئی اور کسان سے شہزادی کو مانگ لیا۔ کسان اور اس کی بیوی نے یہ سوچ کر ہاں کر دی کہ وہ وہاں خوش رہے گی۔ مگر ملکہ نے شہزادی شاہ نور کو مارنے کے لیے یہ سب کیا تھا۔

اب ملکہ نے شہزادی شاہ نور سے پوچھا: ”تمہاری جان کس میں ہے؟“

شاہ نور نے جواب دیا: ”میری جان بادشاہ سلامت میں ہے۔“ یہ سنتے ہی ملکہ نے بادشاہ کو مروا ڈالا، لیکن شہزادی شاہ نور پھر بھی نہ مری تو ملکہ نے پھر پوچھا کہ تمہاری جان کس میں ہے۔ اس بار شہزادی نے وزیر کا نام لیا تو ملکہ نے وزیر کو بھی مروا دیا، لیکن شہزادی اب بھی زندہ تھی۔ چناں چہ ملکہ نے ایک جادوگرنی کی مدد لی تو اس نے بتایا: ”شہزادی کی جان ایک ہار میں ہے۔ اگر تم وہ ہار پہنو گی تو شہزادی مر جائے گی اور اتارو گی تو شہزادی زندہ ہو جائے گی۔“

چناں چہ ملکہ نے کسی طرح وہ ہار حاصل کر لیا۔ ادھر شہزادی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اب زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گی۔ اس نے کسان سے کہا: ”جب میں مر جاؤں مجھے دفن نہ کرنا، بلکہ ایک اونچی جگہ پر کمرہ بنوا کر اس میں چارپائی پر لٹا دینا۔“

پھر شہزادی مر گئی تو کسان نے ایسا ہی کیا۔ جب ملکہ وہ ہار اتارتی تو شہزادی زندہ ہو جاتی۔ ایک رات سوتے وقت ملکہ کے گلے سے ہار گرا تو شہزادی زندہ ہو گئی۔ اسی دوران ایک سانپ نے ملکہ کو ڈس لیا تو وہ مر گئی۔ شہزادی شاہ نور آزاد ہو گئی۔ اب نہ کوئی اس کا دشمن تھا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی خطرہ باقی رہا تھا۔ شہزادی نے کسان اور اس کی بیوی کو بھی اپنے محل میں بلوا لیا جہاں وہ سب خوشی خوشی رہنے لگے۔ n

پیارا دوست

سندیلہ انعم، راولپنڈی

ایک گاؤں میں دو دوست بلو اور ٹیپو رہتے تھے۔ دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔ بلو شریف اور ڈرپوک تھا، مگر ٹیپو شرارتی تھا۔ دونوں ساتھ اسکول جاتے اور ساتھ کھیلتے۔ شام کو دوسرے بچوں کے ساتھ گاؤں میں آم کے درخت کے نیچے کھیلتے تھے۔ ایک روز بلو کے ابو کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ دونوں ٹانگوں سے محروم ہو گئے۔ بلو کی امی نے ان کا بہت علاج کرایا، مگر وہ ٹھیک نہ ہوئے تو بلو کی امی نے گھروں میں ماسی کا کام شروع کر دیا۔ گھر کے حالات خراب ہوتے گئے تو امی نے بلو کو اسکول سے ہٹا کر کباڑ کی ایک دکان پر لگوادیا۔ بلو نے اپنے دولت مند دوست ٹیپو سے مدد مانگی، مگر اس نے کوئی مدد نہیں کی، بلکہ اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

اب بلو اپنے مالک کے حکم پر کباڑ جمع کر کے دکان لاتا تھا۔

ایک روز بلو کے پاس اتنا وزن ہو گیا کہ اٹھانا مشکل ہو گیا تو وہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ کھلی تو وہ آم کے اسی درخت کے نیچے تھا جہاں وہ کھیلتے تھے۔ اچانک اس کی نظر ایک عجیب شکل والے بچے پہ پڑی۔ بلو اسے دیکھ کے ڈر گیا۔

وہ لڑکا بولا: ”ڈرو نہیں، میں تمہارا دوست ہوں۔ میں ٹیپو کی طرح نہیں اور نہ کبھی تمہارا ساتھ چھوڑوں گا۔“

بلو حیرت سے بولا: ”تم کون ہو اور ٹیپو کو کیسے جانتے ہو؟“

لڑکے نے جواب دیا: ”میں ایک جن کا بیٹا ہوں، میرا نام عبداللہ ہے۔ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ آم کے اس درخت پر رہتا ہوں۔“

یہ سن کر بلو ڈرا تو عبداللہ نے کہا: ”مجھ سے مت ڈرو۔ میں تم سے دوستی کرنے اور تمہاری مدد کرنے آیا ہوں۔ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں، جب تم اور ٹیپو اس درخت کے نیچے کھیلتے تھے تو میں بھی دیکھتا تھا۔ بعد میں مشکل وقت میں جب ٹیپو نے تمہاری مدد نہیں کی تو مجھے تم سے اور بھی ہمدردی ہو گئی۔“

غرض ان میں دوستی ہو گئی۔ اب ہر روز عبداللہ بلو کا وزنی سامان اٹھانے میں اس کی مدد کرتا تھا اور اس کا خیال رکھتا تھا۔ ایک روز بلو اور عبداللہ آم کے درخت کے نیچے کھیل رہے تھے کہ گاؤں کے ایک آدمی نے دیکھ لیا۔ وہ بھاگا اور بہت سے گاؤں والوں کو بلا لایا۔ مگر عبداللہ غائب ہو گیا۔ بلو سے گاؤں والوں نے اس بچے کے بارے میں پوچھا تو اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

گاؤں والوں نے ایک فقیر بابا کو بلایا جس نے کوئی عمل پڑھا اور عبداللہ اور اس کے گھر والوں کو آم کے درخت سے بھگا دیا۔

اب تو بلو بہت پریشان ہوا، اس کا واحد دوست بھی چلا گیا تھا۔

ایک روز اسے ویرانے میں عبداللہ ملا اور اس سے کہا: ”اب میں تم سے کبھی نہیں مل سکوں گا، مگر ہر مشکل میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں تم سے دور نہیں ہوں، جب پکارو گے، آجاؤں گا۔“

اس کے بعد بلو کو ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ کوئی اس کے ساتھ ہے اور ضرورت کے وقت اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ واقعی عبداللہ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس کا سچا دوست ہے۔

پیاری سہیلیاں

شاہ بہرام انصاری۔ ملتان

کلاس میں صبا حسب معمول اپنی جگہ کھڑی تھی کہ انعم واپس آئی تو اسے کھڑا دیکھ کر غصے سے بل کھا کر رہ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ اسے تھپڑ مار مار کر بے حال کر دے، مگر مجبوری یہ تھی کہ اس وقت وہ اس سے کافی فاصلے پر تھی۔ اس کے پاس سلیمانی ٹوپی بھی نہیں تھی کہ اسے اوڑھ کر اپنی مرضی کر لیتی اور کسی کو دکھائی نہ دیتی۔ ٹیچر کا لحاظ نہ ہوتا تو شاید اس کے دل کی مراد پوری ہو جاتی۔ خیر کچھ سیکنڈ تک وہ لال پیلی ہوتی رہی، پھر ٹیچر سے اجازت لے کر کلاس میں آ گئی۔ کلاس میں آتے ہی اس کا دل چاہا کہ اپنی سیٹ بدل لے یا کم از کم کچھ دیر کے لیے اپنی جگہ کسی اور کو بٹھا دے، لیکن لیکچر کی وجہ سے مجبوراً اسے اپنی سیٹ پر بیٹھنا پڑا۔

دوسری طرف صبا ہر چیز سے بے خبر بیٹھی تھی۔ شمائلہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے صبا کو دیکھ کر مسلسل ہنس رہی تھی اور سمیرا فرنٹ پر بیٹھی صبا کو کوس رہی تھی۔ انعم تا حال سوچوں کے بھنور میں تھی کہ مس گل ناز کے سوال پوچھنے پر بھی خیالوں میں گم رہی۔ پچھلے ڈیسک پر بیٹھی نسرین نے اسے جھنجھوڑ کر مس کی طرف متوجہ کیا تو انھوں نے دوبارہ سوال پوچھا، مگر صبا جواب نہ دے سکی تو انعم کو اور بھی غصہ آ گیا۔

ویسے بھی وہ بے پروا قسم کی لڑکی تھی۔ نہ کبھی ڈائری لکھتی، نہ لیکچر غور سے نہ سنتی اور نہ ہی سبق یاد کرتی۔ شہر کے مشہور وکیل کی بیٹی ہونے کے باوجود اس میں ان جیسی کوئی ایک خوبی نہیں تھی بلکہ الٹا اس کی ساری عادات ان کے برعکس تھیں۔ ہر وقت فضول باتوں میں لگی رہتی۔ لڑکیوں کا مذاق اڑانا اس کی فطرت میں شامل تھا، یہاں تک کہ اس معاملے میں اپنی عزیز سہیلیوں کو بھی نہیں چھوڑتی تھی۔ انعم کو مٹاپے، سمیرا کو چھوٹے قد اور شمائلہ کو اس کے گھنگریالے بالوں پر بات بے بات طعنے ملتے حتیٰ کہ نسرین پر بھی تنقید ہوتی کہ وہ آنکھیں بند کر کے ہنستی ہے۔ مس گل ناز اکثر اسے نک میکے اعزاز سے نوازتی تھیں۔ گھریلو کام کاج میں وہ امی کا ہاتھ نہیں بٹاتی تھی۔ سہیلیوں اور استانیوں کے علاوہ بہن بھائیوں سے بھی اسے باتیں سننی پڑتیں، مگر بلا کی ڈھیٹ تھی، اس نے کبھی خود کو بدلنے یا بہتر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چھٹی تک انعم نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور وہ بھی دوسری لڑکیوں سے گپیں ہانکتی رہی۔ گھنٹی بجنے پر وہ صبا کو لیے بغیر شمائلہ کے ساتھ ہی گھر چل پڑی۔ صبا عصر کے وقت سو کر اٹھی تو دیکھا کہ پڑوسن خالہ فہمیدہ ان کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ صبا ان کی آمد پر کچھ حیران ہوئی کیوں کہ وہ محلے میں زیادہ نہیں نکلتی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کا چھوٹا بیٹا زاہد بھی تھا۔ باتوں کے دوران پتا چلا کہ وہ زاہد کو صبا سے پڑھوانا چاہتی تھیں۔ یہ سن کر صبا کی جان نکل گئی۔ اس کی امی نے فہمیدہ خالہ سے ہاں کر دی تھی کہ صبا، زاہد کو پڑھا دے گی۔ صبا پریشان ہو گئی۔ اس نے تو آج تک اپنے چھوٹے بھائی کی پڑھائی میں مدد نہیں کی تھی، بلکہ اپنی تعلیم میں بھی دلچسپی نہیں لی تھی، وہ ابھی اسی پریشانی میں تھی کہ دروازے سے شمائلہ، نسرین، سمیرا اور انعم اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ آنسو بہاتی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ چاروں اس کے اس ردعمل پر پریشان ہو گئیں اور اس سے وجہ پوچھی تو صبا نے انہیں اپنی تمام پریشانی سنا ڈالی اور ان سے اس مسئلے کا حل نکالنے میں مدد مانگی۔ وہ چاروں اپنی ہنسی پر کنٹرول نہیں کر پا رہی تھیں، کیوں کہ صبا نے خود ہی اپنے مذاق اڑانے پر معافی مانگ لی اور اپنی پڑھائی پر توجہ دینے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ چاروں نے روزانہ صبا کے گھر آ کر ہوم ورک کرنے کا پروگرام بنا لیا اور صبا سمیت زاہد کو بھی ایک اچھا شاگرد بنانے کی ٹھان لی۔ بے شک وہ اور صبا پکی سہیلیاں تھیں اور اسے "پڑھا کو طالبہ" بنانے کا فیصلہ کر کے انھوں نے اپنی دوستی کو اور بھی پکا کر لیا تھا۔ اتنے میں زاہد "باجی جی السلام علیکم" کہتے ہوئے بستہ پکڑے گھر میں داخل ہوا تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ n

پیاری سی مسکراہٹ

مرزا ظفر بیگ

یہ بڑا خوب صورت دن تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر بڑی گہما گہمی تھی۔ سبھی مسافر ٹرین کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں ہنستے مسکراتے لڑکوں کا ایک گروپ بھی شامل تھا جو آپس میں خوب ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ یہ لڑکے چھٹیاں گزارنے کسی پہاڑی مقام پر جا رہے تھے۔

ریلوے اسٹیشن پر بڑی چہل پہل تھی۔ چائے والے، جوس والے، اخبار بیچنے والے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ چائے کے اسٹالوں اور ریستورانوں پر مسافروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ غرض اسٹیشن دور و قریب جانے والے مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔

اسی لمحے لاؤڈ اسپیکر پر ٹرین کی آمد کا اعلان ہوا تو ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ مسافر اور قلی مستعد ہو گئے۔ بہت سے لوگ جلد از جلد ٹرین میں سوار ہونے کو تیار تھے، تاکہ اپنی سیٹ پر جلدی سے بیٹھ جائیں۔ بعض مسافروں کی سیٹیں پہلے سے بک تھیں اور بعض کی نہیں تھیں۔ ٹرین کی آمد کا اعلان سنتے ہی شوخ لڑکوں کے گروپ نے ایک زور دار خیر مقدمی نعرہ لگایا۔ ٹرین ابھی پوری طرح رکی بھی نہیں تھی کہ شوخ لڑکوں کا وہ پورا گروپ بھاگ کر ڈبے میں داخل ہوا اور سب نے اپنی سیٹیں سنبھال لیں جو پہلے سے بک تھیں۔ کچھ دیر تک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی رہی، پھر اس کے گارڈ نے پہلے سیٹی بجائی اور اس کے ساتھ ہی ہری جھنڈی بھی ہلائی اور ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔

اسی وقت ایک بوڑھا آدمی، ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے کا ہاتھ پکڑے دوڑتا ہوا پلیٹ فارم پر پہنچا۔ انہیں شاید اسی ٹرین سے جانا تھا، وہ بھاگتے ہوئے ایک ڈبے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے جس کے فوری بعد ٹرین کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ اندر داخل ہونے کے بعد انہوں نے بوگی میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو انہیں شوخ لڑکوں کے قریب سیٹیں خالی دکھائی دیں۔ بوڑھے کے ساتھ والا لڑکا بہت خوش بھی دکھائی دے رہا تھا اور حیران بھی۔ اس نے کہا: "ابو! ٹرین تو آگے بڑھ رہی ہے، لیکن سب چیزیں پیچھے کی طرف بھاگ رہی ہیں!"

باپ نے مسکرا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، اس نے یہ بات سن کر زبان سے تو کچھ نہیں کہا، البتہ صرف سر ہلا دیا۔

اب ٹرین کی رفتار خاصی تیز ہو چکی تھی۔ بیٹا ایک بار پھر خوشی کے عالم میں چیخا: "ابو! یہ دیکھیں، تمام درخت ہرے ہیں، اور یہ سب بھی پیچھے کی طرف کتنی تیزی سے دوڑ رہے ہیں۔"

باپ نے مسکراتے ہوئے کہا: "ہاں میرے بیٹے، یہ ہرے ہیں اور پیچھے کی طرف دوڑ رہے ہیں۔"

وہ نوجوان لڑکا کسی چھوٹے سے بچے کی طرح ہر منظر کو بڑے جوش اور خوشی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انجانی سی حیرت تھی۔

اسی وقت ڈبے میں پھل بیچنے والا آواز لگاتا ہوا آ گیا۔ اس کے پاس کینو اور سیب تھے۔ لڑکے نے ان پھلوں کو دیکھا اور اپنے ابو سے بولا: "ابو! میں سیب کھاؤں گا۔" باپ نے بیٹے کو سیب خرید کر دیے۔ لڑکے نے انہیں کھاتے ہوئے کہا: "سیب دیکھنے میں بہت خوب صورت لگ رہے تھے، مگر ان کا ذائقہ تو اور بھی اچھا ہے۔ مزہ آ گیا اسے کھا کر!"

شوخ لڑکوں کا گروپ اس لڑکے اور اس کے باپ کی باتیں بھی سن رہا تھا اور ان کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ بھی رہا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکے نے بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "کیا آپ کا بیٹا بیمار ہے؟ یہ ایسی عجیب و غریب باتیں کیوں کر رہا ہے؟"

اتنے میں اسی گروپ کے ایک اور لڑکے نے زور سے کہا: "مجھے تو یہ لڑکا پاگل لگتا ہے۔"

نوجوان لڑکے کے باپ نے بڑے سکون سے ان دونوں کی باتیں سنیں اور پھر مدھم لہجے میں جواب دیا: "میرا یہ بیٹا اندھا پیدا ہوا تھا، گویا یہ پیدائشی اندھا تھا۔ پھر میں نے اس کا علاج کرایا اور چند روز پہلے ہی اس کی دونوں آنکھوں کا کامیاب آپریشن ہوا تھا جس کے بعد اس کی بینائی ٹھیک ہو گئی۔ اب یہ دیکھ سکتا ہے۔ چوں کہ اس نے یہ سب چیزیں اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھی ہیں، اس لیے زیادہ حیران بھی ہو رہا ہے اور خوش بھی۔"

اپنے باپ کی یہ باتیں سن کر بیٹے نے بڑے فخر سے اس کی طرف دیکھا، پھر نوجوان لڑکوں کی طرف مڑا تو اس کی آنکھوں میں بڑا دکھ تھا۔ شوخ لڑکوں کا گروپ یہ حقیقت جان کر گویا پتھر کا ہو گیا۔ ان سب نے باپ اور بیٹے دونوں سے معافی مانگی کہ انجانے میں وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گئے۔ باپ اور بیٹا محض مسکرا کر رہ گئے۔ ان کے پاس لڑکوں کی بات کا ایک پیاری سی مسکراہٹ کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا۔ n

قومی پرچم کی حرمت

ثناء رحیم، چمکنی پشاور

"سعد! اس جشن آزادی پر کتنا مزہ آیا۔ ہم نے گھر کو کتنی اچھی طرح سجایا تھا اور کتنا خوب صورت لگ رہا تھا ہمارا گھر! اگر دو دن بعد یہ طوفان نہ آتا تو ہمارا گھر کافی عرصے تک سجا رہتا۔" معاذ نے اپنے دوست سعد سے کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سعد نے جواب دیا۔

سعد اور معاذ اسکول میں وقفے کے دوران باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں گھنٹی بجی تو دونوں کلاس میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد سر احمد آئے اور انہوں نے پڑھانا شروع کیا۔ تمام طلبہ توجہ سے انہیں سن رہے تھے۔ جب وہ خاموش ہوئے تو پیریڈ ختم ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ انہوں نے کہا: "چوں کہ ابھی کچھ وقت وقت باقی ہے، اس لیے میں آپ لوگوں کی توجہ ایک خاص بات کی طرف کرانا چاہتا ہوں۔ آپ سب نے جشن آزادی جوش و خروش کے ساتھ منایا ہوگا، ہے ناں؟"

"جی سر!" پوری کلاس نے خوشی سے جواب دیا۔

"اور پھر جھنڈیاں اتار کر سنبھال کر رکھ دی ہوں گی، تاکہ اگلے سال پھر انہی سے گھر سجایا جائے؟" سر نے پوچھا تو اس بار کسی نے ہاں میں جواب نہیں دیا۔

سعد نے سر کو بتایا: "سر! دراصل جشن آزادی کے بعد طوفان آ گیا تھا جس کی وجہ سے تمام جھنڈیاں یا تو اڑ گئیں یا بارش میں بہہ گئیں۔"

سر احمد نے سعد کو افسوس بھری نظروں سے دیکھا اور کہا: "دیکھو بیٹا! جھنڈا یا پرچم ہر ملک کی شان ہوتا ہے اور یہ قوم کا اپنے ملک سے محبت اور وفاداری کا ثبوت ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے اس پہچان کو زمین پر گرا دیتے ہیں تو دراصل ہم اپنے ملک کی عزت کی طرف سے نظریں پھیر لیتے ہیں، اسے زمین پر دے مارتے ہیں۔ بارش یا طوفان آئے تو ان جھنڈیوں کو اسی طرح ڈھانپ دینا چاہیے جس طرح ہم اپنی قیمتی چیزوں کو ڈھانپتے ہیں اور ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارا پرچم بھی ہمارا قیمتی اثاثہ ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر مشکل وقت میں یا کسی بھی قدرتی آفت کی صورت میں اس کو ادھر ادھر نہ گرنے دیں اور اس کا خیال رکھیں۔" سب بچوں نے سر سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اپنے قومی پرچم کی حرمت کا خیال رکھیں گے۔

ریچھ کی معافی

محمد شعیب خان، واہ کینٹ

پرانے زمانے کی بات ہے۔ ایک دریا کے کنارے ایک بڑا سرسبز جنگل واقع تھا جس میں ہر قسم اور ہر نسل کے جانور پائے جاتے تھے۔ جنگل کا بادشاہ شیر بہت رحم دل اور بہادر تھا۔ اس کا حکم تھا کہ کوئی جانور دوسرے جانور کا شکار نہ کرے اور نہ کوئی کسی پر ظلم کرے، لیکن گوشت خور جانور دریا کی مچھلیاں کھا سکتے ہیں۔ وہ خود بھی اس قانون پر عمل کرتا تھا، اسی لیے جنگل کے تمام جانور ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر ان میں کوئی لڑائی جھگڑا ہوتا تو بادشاہ اس کا فیصلہ کرتا۔

آج بھی اسی سلسلے میں شیر کا دربار لگا ہوا تھا۔ سب جانور اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ مقدمہ ریچھ کے خلاف تھا جس شہد کی مکھیوں کے چھتے پر حملہ کر کے سارا شہد کھالیا تھا۔ شیر کے الٹے ہاتھ پر ملزم ریچھ سر جھکائے کھڑا تھا اور دائیں طرف شہد کی مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ شیر نے اس سے کہا: ”بھن بھنانا بند کرو۔“

کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ ایک دم رک گئی۔ اب شیر نے دہاڑ کر ریچھ سے پوچھا: ”تم شہد کی مکھیوں کے چھتے پر حملے کیا تھا؟“

ریچھ نے اقرار میں سر ہلایا تو شیر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے اعلان کیا: ”مقدمے کا فیصلہ کل سنایا جائے گا۔“

اسی دوران ایک بھیڑیا ہانپتا کانپتا دربار میں داخل ہوا تو سب جانور اسے دیکھنے لگے۔

بھیڑیے نے جلدی جلدی شیر کو بتایا: ”جب میں دریا پر پانی پینے گیا تو وہاں کچھ انسان (شکاری) نظر آئے۔ وہ جانوروں کو پکڑنے کے لیے جال لگا رہے ہیں۔ کے پاس بندوقیں بھی ہیں۔ شکاریوں کے بچے بھی اُن کے ساتھ ہیں....“

ابھی بھیڑیے کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک زرافہ دوڑتا دربار میں داخل ہوا اور زور زور سے رونے لگا: ”بادشاہ سلامت! شکاریوں نے میرے دو ننھے منے بچوں کو پکڑ کر ایک گاڑی میں بند کر دیا ہے۔“

زرافے کی فریاد سن کر شیر غصے سے دہاڑا تو پورا جنگل لرز اٹھا۔ ”ہم ان انسانوں کو اس ظلم کا مزہ چکھائیں گے۔“ یہ کہہ کر شیر نے دو چار چکر کاٹے اور پھر ریچھ اور شہد کی مکھیوں کو تیاری کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں متعدد ریچھ اور ہزاروں شہد کی مکھیاں وہاں جمع ہو گئیں۔ شیر انہیں ساتھ لے کر دریا کی طرف روانہ ہوا۔ جنگل کے قریب پہنچ کر شیر نے شہد کی مکھیوں کو شکاریوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور ریچھ کو حکم دیا کہ تم شکاریوں کے بچوں کو اُٹھا کر جنگل کی طرف بھاگو۔ اب تک شکاری کئی جانوروں کو پکڑ کر گاڑی میں ڈال چکے تھے۔ اپنی کامیابی پر وہ سب بہت خوش تھے کہ اچانک شہد کی مکھیوں نے شکاریوں پر اتنی تیزی سے حملہ کیا کہ وہ سنبھل بھی نہ سکے اور سب کچھ بھول کر اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگے۔ اسی دوران ریچھ اپنا کام کرنے لگے۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنے قیدی ساتھیوں کو رہا کرایا اور پھر شکاریوں کے بچوں کو پکڑ کر جنگل کی راہ لی۔

کی مکھیوں کا حملہ ختم ہوا تو سارا منظر بدل چکا تھا۔ اپنے بچوں کو غائب دیکھ کر شکاری رونے لگے۔ جنگل کا بادشاہ شیر، یہ سارا منظر چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ شکاریوں کی پریشانی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا اور اُن کے سامنے آگیا۔ اتنے بڑے شیر کو اپنے سامنے دیکھ کر شکاری ڈر گئے۔ پھر شیر نے انسانوں کی زبان بولنے والے ذہین طوطے کو طلب کیا اور اس سے کہا: ”ان شکاریوں سے کہو کہ اگر یہ شکاری توبہ کر لیں کہ آئندہ اس جنگل کے جانوروں کا شکار نہیں کریں گے تو ہم ان کے بچوں کو چھوڑ دیں گے۔“

طوطے نے یہ بات شکاریوں سے کہی تو انہوں نے ہاتھ جوڑ کر پکا وعدہ کیا کہ ہم زندگی بھر اس طرف کا رخ بھی نہیں کریں گے۔

چناں چہ شیر بادشاہ نے ریچھ کو حکم دیا کہ وہ شکاریوں کے بچے لے آئیں۔ ریچھ نے اس حکم کی تعمیل کی اور شکاری اپنے بچوں کے ساتھ چلے گئے۔

اگلے دن پھر شیر کا دربار لگا۔ مجرم ریچھ سر جھکائے فیصلے کا منتظر تھا۔ سب جانوروں کی نظریں شیر پر تھیں۔ شیر نے کچھ کہنا چاہا تو شہد کی مکھیوں کی ملکہ بولی: ”بادشاہ سلامت! ہمارا اندازہ ہے کہ ریچھ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔“

یہ سنتے ہی ریچھ زور زور سے رونے لگا۔ اس نے کہا: ”اس بار مجھے معاف کر دیں، آئندہ میں شہد کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں!“

شیر نے کہا: ”اگر شہد کی مکھیاں تمھیں معاف کر دیں تو تمھاری ٹھیک ورنہ سخت سزا ملے گی!“

بادشاہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ملکہ مکھی نے ریچھ کو معاف کرنے کا اعلان کر دیا۔n

سب سے قیمتی تحفہ

عثمان اکرم۔ ملتان

انس اور ارشان دونوں گہرے دوست تھے۔ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ انس دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور ارشان غریب گھرانے سے۔ دونوں ہی پڑھائی میں بہت اچھے تھے، اپنے ٹیچرز کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دیتے تھے۔ آج اسکول میں خالی پیریڈ میں انس نے ارشان سے کہا: ”ارشان! تمہیں پتا ہے ایک ہفتے بعد میری سالگرہ آرہی ہے اور تمہیں ضرور آنا ہے۔“ اس کی بات سن کر ارشان گہری سوچ میں پڑ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ انس کو کوئی اچھا سا گفٹ خرید کر دوں۔

”کہاں کھو گئے میرے دوست؟“ انس نے ارشان کو جھنجھوڑ کر کہا: ”بس تم آرہے ہو۔“

ارشان نے اسے ٹالتے ہوئے کہا: ”نہیں، میں نہیں آسکتا۔ تم تو جانتے ہو میں کہ اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہتا اور نہ ہی مجھے اجازت ہے۔ تم میرے بابا کو جانتے ہو کہ وہ کتنے سخت مزاج ہیں۔“

انس نے ارشان کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ”تم ان کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارے پاپا سے بات کرلوں گا۔“

ارشان کو یقین تھا کہ اس کے پاپا نہیں مانیں گے اور اس طرح یہ بات ٹل جائے گی۔ اتنے میں میتھ کے پیریڈ کی بیل بجی اور میتھ کے ٹیچر نے آکر پڑھانا شروع کردیا۔

چھٹی کے بعد انس نے ارشان سے کہا: ”تم فکر نہ کرو، میں شام کو تمہارے پاپا سے ملنے آؤں گا، اللہ حافظ!“ یہ کہہ کر انس چلا گیا اور ارشان مرجھایا سا چہرہ لے کر اپنے گھر پہنچا۔ اس نے اپنا بیگ رکھا اور منہ ہاتھ دھو کر لیٹ گیا اور فوراً ہی سو گیا۔

”ارشان بیٹا! باہر آؤ۔ کھانا تو کھالو، جب سے آئے ہو، سوئے جارہے ہو۔“ اپنی امی کی آواز سن کر ارشان کی آنکھ کھل گئی۔ اتنے میں اس کی امی اندر آگئیں۔ اندر کا منظر دیکھ کر بولیں: ”اتنی گرمی میں تم نے پنکھا بھی نہیں چلایا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے پنکھا کھولا اور کمرے کی کھڑکیاں کھول کر باہر آگئیں۔ ارشان نے کھانا کھایا اور واپس کمرے میں آکر پھر سو گیا۔ مغرب کے وقت اس کی آنکھ کھلی۔ اس وقت تک پاپا بھی آچکے تھے۔ ارشان جاکر صحن میں بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پاپا دروازہ کھولنے کے لیے اٹھے تو ارشان نے کہا: ”پاپا! آپ بیٹھیں، میں دیکھتا ہوں کون ہے؟“

اس نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے انس کو پایا۔ انس نے ارشان کی امی اور پاپا کو سلام کیا اور اندر آگیا۔ آتے ہی اس نے کہا: ”انکل! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”کہو بیٹا، کیا بات ہے؟“ ارشان کے ابو نے کہا۔

انس بولا: ”انکل! اگلے ہفتے میری سالگرہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ارشان اس میں شرکت کرے۔ یہ آئے گا تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

”دیکھو بیٹا، تمہارا گھر ہمارے گھر سے کافی فاصلے پر ہے اور ارشان اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہتا۔ پھر اتنی رات کو وہ اکیلا گھر واپس کیسے آئے گا۔“ ارشان کے پاپا نے کہا۔

”انکل! آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے اپنے ڈرائیور کے ساتھ بھیج دوں گا۔“ اب ارشان کے پاپا کے پاس کوئی بہانہ نہیں بچا تھا، انس کے بے حد اصرار پر وہ مان گئے۔

انس نے ارشان کی طرف گھوم کر کہا: ”دیکھا ارشان! میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے پاپا مان جائیں گے۔ اب تم تیار رہنا، اگلے ہفتے۔“ اس کے بعد انس نے ان سے اجازت لی اور اپنے گھر چلا گیا۔ انس کی سالگرہ میں ایک دن رہ گیا تھا۔ ارشان صحن میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل انس کو تحفے میں کیا دوں۔ اتنے میں اس کی امی صحن میں آئیں اور کہا: ”بیٹا! تم اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو؟ کیا بات ہے، مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”امی! آپ تو جانتی ہیں کہ کل انس کی سالگرہ ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کیا گفٹ دوں۔ میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں کہ کوئی اچھا سا گفٹ خرید سکوں۔“

”بیٹا تم سوچنا بند کرو۔ یہ پچاس روپے لو اور بازار سے ایک اچھا سا سالگرہ کارڈ لے آؤ۔“ اس کی امی نے پچاس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”مگر امی! اس سے کیا ہوگا، یہ تو انس کو پسند بھی نہیں آئے گا۔“ ارشان نے چڑتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! تم دیکھ لینا، انس کو تمہارا ہی گفٹ پسند آئے گا۔ بس اب بازار جاؤ اور جلدی سے ایک سالگرہ کا کارڈ لے آؤ۔“

امی کے کہنے پر ارشان بازار گیا اور ایک خوب صورت سالگرہ کارڈ لے آیا۔

”اب اس پر ایک خوب صورت ڈرائنگ بناؤ اور مارکر سے اس کے نام ایک خط بھی لکھو۔ کچھ اپنی اور کچھ اس کے بچپن کی تصویریں بھی اس کارڈ پر چپکادو۔ سالگرہ کارڈ تیار!“

امی کی تجویز ارشان کو اچھی لگی۔ اس نے ان کی مدد سے کارڈ تیار کیا اور مطمئن ہو کر سو گیا۔ دوسرے دن ارشان شام کو سالگرہ پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور رات ہوگئی۔ پھر ارشان نے نہا دھو کر عید والا جوڑا پہنا، کارڈ اٹھایا اور چل پڑا۔

انس کے گھر کی سجاوٹ دیکھ کر ارشان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انس نے ارشان کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا۔ ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب انس کیک کاٹنے لگا تو پورے گھر میں ”ہپی برتھ ڈے ٹو یو“ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پھر انس نے کیک کاٹا اور مہمانوں نے انس کو تحائف دینے شروع کیے۔ سب مہمان تحائف دے چکے تو ارشان کی باری آئی۔ ارشان اپنا چھوٹا سا کارڈ لے کر انس کے پاس گیا اور اسے دعاؤں کے ساتھ کارڈ دیا۔ انس نے کارڈ کھول کر دیکھا تو اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ اس نے ارشان کو سینے سے لگایا اور بلند آواز میں کہا: ”تحفہ ہو تو ایسا!“ دیگر مہمان انس کی بات سن کر سوچنے لگے کہ اس چھوٹے سے کارڈ کو یہ سب سے اچھا کہہ رہا ہے جب کہ ہمارے تحفے تو اس سے کئی گنا اچھے اور مہنگے ہیں۔ انس سب کی نظریں دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا: ”مجھے یہ کارڈ اس لیے پسند آیا ہے کہ اس میں بہت کچھ ہے۔ میرے دوست نے مجھے آج زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے۔“

سالگرہ ختم ہوئی تو انس نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ وہ ارشان کو اس کے گھر چھوڑ آئے۔ ارشان نے انس کو خدا حافظ کہا اور کار میں بیٹھ گیا۔ گھر آکر ارشان نے اپنی امی کو ساری کہانی سنائی اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا: ”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔“

ارشان کی امی نے مسکرا کر اپنے بیٹے کو دیکھا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ n

سفید مرغی

شائستہ انجم۔ واہ کینٹ

احمد، احسن اور فاطمہ اپنے گھر کے باغیچے میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ احمد باغیچے کی چار دیواری والی جھاڑیوں کے پیچھے چھپا تھا کہ اس کی نظر جھاڑیوں کے اندر بیٹھی سفید مرغی پر پڑی جو احمد کے آنے پر کٹ کٹ کٹاک کٹاک کرتے ہوئے بھاگ گئی۔ یہ دیکھ کر احمد کی باچھیں کھل گئیں۔ وہاں زمین پر ایک انڈا بھی پڑا تھا۔ احمد نے پلک جھپکتے انڈا اٹھایا اور احسن اور فاطمہ کو دکھایا۔ اس کے بعد امی کو بتائے بغیر ان تینوں نے اس کا آملیٹ بنا کر کھالیا۔

دوسرے دن بھی احمد نے اسی جگہ سے انڈا اٹھایا جہاں سے گزشتہ دن اٹھایا تھا۔ اب وہ تینوں بہن بھائی باغیچے میں کھیلنے سے زیادہ انڈا حاصل کرنے کی دوڑ میں مگن رہتے تھے، کیوں کہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ سفید مرغی روزانہ اسی جگہ انڈا دے گی۔ چناں چہ وہ کھیلتے وقت جھاڑیوں کے آس پاس منڈلاتے رہتے جس کے بعد احسن، کبھی فاطمہ اور کبھی احمد انڈا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

ایک دن تینوں بہن بھائی آپس میں بحث کر رہے تھے کہ آج انڈا کون لے گا؟

احمد بولا: ”آج انڈا میں لوں گا، کیوں کہ سب سے پہلے میں نے یہاں سے انڈا دریافت کیا تھا۔“

یہ سن کر جلدی سے احسن بولا: ”بھائی! آج انڈا میں لوں گا اور اسے ابال کر کھاؤں گا۔“

یہ سن کر فاطمہ جھٹ بولی: ”میں سب سے چھوٹی ہوں، اس لیے آج ملنے والے انڈے پر میرا حق ہو گا۔“

جیسے ہی شام ڈھلنے لگی، تینوں بہن بھائی جھاڑیوں کی طرف لپکے اور اندر ہاتھ بڑھایا مگر یہ کیا؟ نہ تو یہاں سفید مرغی تھی اور نہ ہی اس کا انڈا تھا۔

یہ دیکھ کر احسن بولا: ”ارے! یہ مرغی کہاں چلی گئی؟“

”میرے پاس!“ پیچھے سے ایک کرخت آواز آئی۔ تینوں نے مڑ کر دیکھا تو پڑوسن خالہ غصے کے عالم میں ان کے سامنے کھڑی تھیں۔ دراصل وہ سفید مرغی پڑوسن خالہ کی ملکیت تھی جو احمد کے باغیچے میں انڈے دیا کرتی اور پڑوسن خالہ انڈوں سے محروم رہ جاتیں۔ جب انہوں نے ان تینوں بچوں کی کارستانی سے ان کی امی کو آگاہ کیا تو امی بہت ناراض ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بغیر اجازت کسی کی چیز کیوں لی گئی۔ انہوں نے احمد، احسن اور فاطمہ کو بغیر اجازت کسی کی چیز اٹھانے پر پہلے تو خوب ڈانٹ پلائی اس کے بعد ان سے کہا: ”اگر تم تینوں نے امتحان اچھے نمبر سے پاس کر لیا تو میں تمھیں بازار سے سفید مرغی منگوا کر دوں گی۔“

چناں چہ بچوں نے خوب محنت سے امتحانات کی تیاری کی اور امی نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا۔ ان کے گھر کے آنگن میں ایک ڈربے کا اضافہ ہو گیا جس میں ایک سفید مرغی موجود تھی۔

اب احمد، احسن اور فاطمہ اس ڈربے کے آس پاس منڈلاتے، مگر اب انہیں کسی بات کا ڈر نہیں تھا، کیوں کہ اس مرغی اور اس کے انڈوں پر ان کا ہی تو حق تھا۔n

سہارا

وقاص اسلم، کمبوہ

شادی کے پندرہ سال بعد اکبر خان کو اللہ نے بیٹا عطا فرمایا جس کا نام "گڈو" رکھا گیا۔ دونوں میاں بیوی اسے پاکر بے حد خوش تھے اور دن رات اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

اس روز سب لوگ اپنے معمولات میں لگے تھے کہ عصر کے وقت بڑی مسجد سے اعلان ہوا: "دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے اور کل صبح تک سیلابی ریلا اس علاقے میں پہنچ جائے گا۔ بستی والے اپنے خاندانوں اور قیمتی سامان کے ساتھ محفوظ مقامات پر چلے جائیں۔"

اکبر خان اور اس کی بیوی آسیہ یہ سن کر پریشان ہوئے، کیوں کہ گڈو ابھی صرف پانچ روز کا تھا۔ اس ننھی سی جان کو ساتھ لے کر جانا بہت مشکل تھا اور پھر آسیہ کی بیوی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وہ دونوں ننھے گڈو کو لے کر محفوظ علاقے کی طرف چل دیے۔ اپنی بیل گاڑی پر انہوں نے ضروری سامان لاد لیا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی شروع ہو چکی تھی۔

انہوں نے کوشش کی کہ کسی کے گھر پناہ مل جائے، تاکہ بچے کو سنبھالنے میں پریشانی نہ ہو۔ مختلف گھروں پر گئے، ان سے مدد کی درخواست کی، لیکن کوئی بھی ان کو رکھنے کو تیار نہ تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ بارش بھی ہونے لگی تھی۔ دونوں بیل گاڑی کو لیے ایک بستی کی طرف جا رہے تھے۔

آسیہ نے ننھے گڈو کو سینے سے لگا رکھا تھا اور اللہ سے دعا کر رہی تھی کہ کہیں پناہ مل جائے۔ کچھ ہی دیر میں وہ اگلی بستی میں پہنچ گئے اور ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

دوسری طرف دستک کی آواز سن کر نور جلدی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے دروازہ کھولا تو اکبر، آسیہ اور گڈو دکھائی دیے۔ نور کچھ پوچھے بغیر انہیں اندر کمرے میں لے گیا جہاں اس کی بوڑھی ماں چارپائی پر لیٹی تھی۔

آنے والوں کو دیکھتے ہی بوڑھی عورت نے جلدی سے کہا: "مصیبت زدہ ہو ناں، جتنے دن چاہو یہاں رہو، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

اکبر اور آسیہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے، انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ آخر کار انہیں ٹھکانا مل گیا۔

نور نوجوان لڑکا تھا، ایک فیکٹری میں ملازم تھا اور اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ اس کا والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ نور بہت نیک انسان تھا۔ صبح فیکٹری چلا جاتا اور شام کو واپس آتا۔ اکبر گھر میں سودا سلف وغیرہ لا کر دیتا۔ جلد ہی وہ آپس میں گھل مل گئے تھے۔

نور اور اس کی بوڑھی ماں مہمانوں کی خدمت کرتے اور انہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دیتے۔ نور کی بوڑھی ماں اکثر گڈو کا اپنی گود میں لے کر پیار کرتی تھی۔ اس دوران اکبر کی بیوہ آسیہ گھر کے کام کاج کر لیتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ پانی کا زور کم ہو گیا تو ویران اور اجڑی بستیاں پھر سے آباد ہونے لگیں۔ ننھے گڈو کی چوں چاں بھی اب شرارتوں میں بدلنے لگی تھی۔ اکبر اور آسیہ نے واپس جانے کی اجازت مانگی تو نور اور اس کی بوڑھی ماں نے دکھے دل سے اجازت دی۔ جاتے وقت اکبر اور آسیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، نور اور اس کی ماں بھی پریشان تھے۔ لیکن وہ دونوں ماں بیٹے خوش بھی تھے کہ اللہ پاک نے انہیں کسی کے لیے سہارا بنایا تھا۔ n

سمندر کا پانی نمکین کیوں ہے؟

رجاء جمال۔ کراچی

ہم سب جانتے ہیں کہ سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے، مگر تازہ پانی جیسے بارش کا پانی، دریاؤں، چشموں اور ندی نالوں میں بہنے والا پانی بھی نمکین نہیں ہوتا۔ آخر کرۂ ارض پر پایا جانے والا کچھ پانی نمکین اور کچھ میٹھا کیوں ہوتا ہے۔

تازہ پانی میں بھی مکمل طور پر نمک سے پاک نہیں ہوتا۔ اسی طرح بارش کے پانی میں بھی نمک کے اثرات ہوتے ہیں۔ جب بارش کا پانی مٹی اور چٹانوں سے چھن کر گزرتا ہے تو اس میں موجود بعض معدنیات پانی میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس پراسیس کو ہم انگریزی میں weathering کہتے ہیں۔ یہی پانی ہم پیتے ہیں، اس میں نمک تو ہوتا ہے لیکن اس کی مقدار اتنی کم ہوتی ہے کہ ہمیں اس کا ذائقہ محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے بعد یہ پانی چشموں اور جھیلوں سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ اس میں کچھ معدنیات بھی شامل ہوتی ہیں، مگر یہ برائے نام ہوتی ہیں۔

دنیا میں کچھ جھیلیں بہت زیادہ نمکین ہیں جن میں گریٹ سالٹ لیک اور بحیرہ مردار شامل ہیں۔ ان کا پانی سمندر کے پانی سے لگ بھگ دس گناہ زیادہ نمکین ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صرف انہی جھیلوں کا پانی نمکین کیوں ہے، دوسری جھیلوں کا پانی ایسا کیوں نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جھیلیں پانی کی عارضی ذخیرہ گاہ ہوتی ہیں۔ دریا اور چشمے اپنا پانی ان جھیلوں میں ڈالتے ہیں اور دوسرے دریا اس پانی کو جھیلوں سے باہر لے جاتے ہیں۔

دنیا میں پائی جانے والی گریٹ سالٹ لیک، بحیرہ مردار اور دوسری نمکین پانی کی جھیلوں میں پانی نکلنے کے راستے نہیں ہیں، ان کا پانی صرف بھاپ بن کر ہی اڑتا ہے۔ چناں چہ جب ان کا پانی بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے تو نمک نیچے باقی رہ جاتا ہے، اس لیے بعض جھیلیں زیادہ نمکین ہیں، کیوں کہ ان میں شروع سے نمک باقی رہتا چلا آرہا ہے اور اس طرح بعض جھیلوں میں یہ پانی مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے سمندر بھی اسی لیے نمکین ہیں کہ ان کے پانی میں موجود نمک کو باہر نکلنے کے موقع نہیں ملتا، بلکہ پہلے سے موجود نمک بھی بڑھتا رہتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں برسوں سے یہی سلسلہ چل رہا ہے جس کی وجہ سے سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے اور دریاؤں یا جھیلوں کا پانی میٹھا ہوتا ہے۔n

سمیر کا وعدہ

سدرہ رحمٰن۔ سرگودھا

"ثنا، ثنا! کہاں ہو تم؟" سمیر چیختے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو ثنا ڈر گئی۔

"کیا ہوا؟ اتنا چیخ کیوں رہے ہو؟" ثناء نے کہا۔

"جلدی سے میرا کالا سوٹ استری کر دو، لائٹ جانے والی ہے۔"

"اتنی سی بات پر تم نے پورا گھر سر پہ اٹھا لیا؟" ثنا غصے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"اچھا اب جلدی سے استری کر دو۔" سمیر یہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔ آج اس کے دوست عمیر کی مہندی کا فنکشن تھا۔

سمیر تیار ہو کر آٹھ بجے گھر سے نکلنے لگا تو دادی اماں کی آواز آئی: "سمیر بیٹا! دھیان سے جاؤ اور جلدی آ جانا۔"

سمیر "جی اچھا" کہہ کر منہ بناتا ہوا باہر نکل گیا۔ راستے میں زاہد، عامر اور بابر بھی مل گئے اور یوں فائیو اسٹارز کا یہ گروپ عمیر کے گھر اکٹھا ہو گیا۔ انہوں نے اپنے جگری دوست کی شادی کو خوب انجوائے کرنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔

رات کا ایک بجا تھا۔ سمیر نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ آہٹ کی آواز سن کر دادی اماں نے اسے آواز دی: "سمیر بیٹا! ادھر آؤ!" سمیر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا:

"بیٹا! کھانا وغیرہ کھایا ہے؟"

"جی اماں!" سمیر نے کہا۔

"بیٹے! مجھے تمہاری ایک عادت سے تکلیف ہوتی ہے۔ تم نماز کی پابندی نہیں کرتے، اس سے گھر میں بے برکتی ہوتی ہے۔" دادی اماں نے کہا تو سمیر نے دل میں سوچا کہ ایک بار پھر اماں کی نصیحتوں کی پٹاری کھل گئی۔

"اچھا اماں ٹھیک ہے، بہت تھک گیا ہوں، نیند بھی آ رہی ہے۔ صبح انٹرویو کے لیے جانا ہے اور ایک جگہ ٹیسٹ بھی دینا ہے۔" سمیر نے اماں کی باتوں پر کان دھرے بغیر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دادی اماں اسے دیکھتی رہ گئیں۔

سمیر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کی ایک چھوٹی بہن ثناء تھی۔ والدین کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا اور رہی سہی کسر یونیورسٹی کے دوستوں نے پوری کر دی تھی۔ دو سال پہلے اس نے یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا۔ اس دوران اس کے والدین ایک حادثہ میں چل بسے تھے۔ ان کے بعد ثنا اور دادی اماں ہی اس کی دنیا تھے۔ اس نے کئی جگہ نوکری کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ مل سکی۔

"ثنا بیٹی! سمیر کو بھی جگا دو، نماز پڑھ لے گا۔" دادی اماں نے سلام پھیرتے ہی ثنا سے کہا جو قرآن کی تلاوت کر رہی تھی۔ ثنا نے بھائی کو جگانے کی بہت کوشش کی، لیکن سمیر کروٹ بدل کر دوبارہ سو گیا۔

سات بجے وہ سو کر اٹھا، نہا دھو کر ناشتا کیا اور دادی اماں سے دعائیں لے کر ٹیسٹ دینے چلا گیا۔ واپسی پر سمیر کا منہ لٹکا ہوا تھا، وہ چپ چاپ اندر جا کر لیٹ گیا۔ دادی اماں بھی اس کی شکل دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے اسے آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور پریشانی کی وجہ پوچھی تو سمیر نے کہا: "اماں! میری تو قسمت ہی خراب ہے۔"

سمیر کی عادت تھی کہ وہ اپنی ہر ناکامی کا الزام قسمت پر لگاتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "جہاں بھی ٹیسٹ یا انٹرویو دینے جاتا ہوں ہمیشہ کوئی مسئلہ آڑے آ جاتا ہے، اچھی تیاری کر کے جاتا ہوں لیکن ناکامی ہی ملتی ہے۔"

سمیر کے شکوے شکایات جاری تھے کہ اماں بول پڑیں: "دیکھو بیٹا! تم ہر وقت اپنی قسمت کو ہی برا بھلا کہتے رہتے ہو۔ ہر وقت شکوہ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ اپنی کوشش کے بعد بھی اگر اللہ مدد مانگی جائے تو بات بنتی ہے۔

دن میں پانچ مرتبہ تمہارا رب تمہیں کامیابی کی طرف بلاتا ہے، لیکن تم نہیں سنتے۔ راتوں کو دیر تک دوستوں کے ساتھ وقت ضائع کرتے ہو، مگر مسجد جانے کے لیے تمہارے پاس وقت نہیں ہوتا۔ تمہاری صبح کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب پرندے بھی اس رب کی تسبیح کر چکے ہوتے ہیں۔ اصل قصور تمہارا ہے، قسمت کا نہیں۔ تم اپنے رب کو راضی کر لو، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔"

سمیر غور سے دادی اماں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے سے شرمندگی عیاں تھی۔ وہ بولا: "اماں! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اصل راستہ چھوڑ دیا۔ میرا اپنے رب سے وعدہ ہے کہ انشاءاللہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت پڑھوں گا اور اپنے رب سے دعا بھی کروں گا۔" سمیر نے پر عزم لہجے میں کہا تو اماں کا دل خوش ہو گیا اور انہوں نے سمیر کو اپنے گلے لگا لیا۔ n

سانپ نے ایسا کیوں کیا؟

علیشہ حسین۔ کراچی

ایک کسان اپنے کھیت میں ہل چلا رہا تھا کہ اسے ایک سایہ دار جھاڑی کے نیچے سانپ کے انڈے دکھائی دیے۔ کسان نے ہل روکا، ان انڈوں کو درخت کے صاف پتے پر اٹھایا اور انہیں ٹوٹنے سے بچانے کے لیے کھیت کے باہر ایک جھاڑی کے نیچے رکھ دیا۔

اس کے بعد کسان دوبارہ کام میں لگ گیا۔ ابھی اسے ہل چلاتے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ سانپ بہت تیزی سے رینگتا ہوا اس جھاڑی کے پاس آیا جہاں اس کے انڈے رکھے تھے، مگر وہ جھاڑی ہل کی زد میں آکر اکھڑ چکی تھی۔ وہاں سانپ کے انڈے بھی نہیں تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سانپ کو غصہ آگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ سارا کام کسان کا ہے۔ وہ تیزی سے اس درخت کی طرف رینگا جہاں کسان کا پانی سے بھرا ہوا گھڑا رکھا ہوا تھا۔ سانپ نے اس گھڑے میں اپنے زہر کی پچکاری ماری اور اس طرح کسان سے اپنا انتقام لیا۔ پھر غصے کی حالت میں سانپ کھیت کے چاروں طرف چکر لگانے لگا۔ کافی دیر بعد اسے اپنے انڈے کھیتوں سے دور ایک محفوظ سایہ دار جھاڑی کے نیچے رکھے نظر آئے۔ اس نے قریب جاکر دیکھا تو وہ اس کے اپنے ہی انڈے تھے جنہیں کسان نے ضائع ہونے سے بچانے کے لیے کھیت کے باہر ایک جھاڑی کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اب سانپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ کسان تو اس کا محسن تھا۔ اس نے سانپ کے انڈوں کو ضائع ہونے سے بچاکر اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اس نے جلدی سے فیصلہ کیا کہ کسان کو اب میرا زہر آلود پانی نہیں پینا چاہیے ورنہ وہ مر جائے گا جو یہ ایک بہت بڑا ظلم ہوگا۔ سانپ فوری طور پر درخت کے نیچے رکھے گھڑے کی طرف لپکا اور اس نے اپنی دم سے اچھے طریقے سے گھڑے کو لپیٹ کر ایسا زور سے جھٹکا مارا کہ اس کا سارا پانی زمین پر بہہ گیا۔ کسان ہل چلانے کے بعد بیلوں کو کھڑا کر کے درخت کے نیچے پانی پینے آیا تو اس نے دیکھا کہ گھڑا الٹا ہوا ہے اور اس میں ایک بوند پانی نہیں ہے۔

کسان کا ایک ساتھی دوسرے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس نے کسان کو پورا واقعہ سنا دیا کہ سانپ نے پہلے تو پانی میں زہر کی پچکاری ماری اور بعد میں گھڑے کو اپنی دم میں لپیٹ کر اس طرح گرا دیا کہ اس میں ایک بوند پانی نہ بچے۔ وہ دونوں کافی دیر تک یہی سوچتے رہے کہ سانپ نے ایسا کیوں کیا؟

شیخ سعدی کی حکایت

محمد علیم نظامی۔ لاہور

کہا جاتا ہے کہ ایک ضرورت مند نے ایک بزرگ سے مشکل وقت میں مالی مدد مانگی۔ اتفاق سے اس وقت بزرگ کے پاس کچھ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے ضرورت مند سے معذرت کرتے ہوئے کہا: ''معافی چاہتا ہوں۔ اس وقت میرے پاس اتفاق سے کچھ نہیں۔ اگر ہوتا تو ضرور دے دیتا۔''

مانگنے والے کو یقین نہ آیا کہ بزرگ سچ بول رہے ہیں۔ لہٰذا اس نے بزرگ کے گھر سے باہر آ کر انہیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

ان بزرگ کا ایک شاگرد اس کے پاس سے گزرا اور اپنے استاد کو برا بھلا کہتے سنا تو اسے بہت طیش آیا۔ اس نے آ کر یہ ساری روداد اپنے بزرگ استاد کو سنائی اور بتایا کہ فلاں شخص آپ کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔

بزرگ نے یہ سن کر کہا کہ مجھے تکلیف اس شخص نے نہیں، بلکہ تم نے پہنچائی ہے۔ اس نے جو کچھ کہا، وہ میں نے نہیں سنا اور نہ ہی مجھے کوئی تکلیف پہنچی، مگر تم نے آ کر جب مجھے بتایا تو مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ اگر تم یہ سب کچھ مجھے نہ بتاتے تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ وہ مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے۔ تمہاری مثال تو ایسی ہے کہ ایک دشمن نے میری طرف تیر پھینکا جو مجھ تک پہنچنے سے پہلے گر گیا۔ تم وہ تیر اٹھا کر میرے پاس لے آئے اور میرے پہلو میں چبھو رہے ہو۔ وہ شخص جو برائیاں بیان کر رہا ہے، ان کی تعداد ان برائیوں سے بہت کم ہے جو ہمارے اندر موجود ہیں۔ یوں وہ میرا محسن ہے جو میری برائیوں کو کم کر کے بتا رہا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی گواہی قیامت کے روز قبول کر لی تو مجھے جہنم سے نجات مل جائے گی۔''

اس حکایت میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی پیٹھ پیچھے کوئی برائی کرے تو اسے اس شخص تک نہیں پہنچانا چاہیے، کیوں کہ اس سے لوگوں کی درمیان دشمنی اور کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خونی رشتے ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیٹھ پیچھے بات کرنے اور برائی سے منع فرمایا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو دوسرے شخص کی برائی کرتے سنے جو وہاں موجود نہیں تو اسے متعلقہ شخص تک نہ پہنچائے، بلکہ کوشش کرے کہ ان دونوں کے مابین تعلقات اچھے ہو جائیں اور اگر کوئی اچھی بات بھی اپنی طرف سے کہنی پڑے تو کہہ دینی چاہیے۔ n

شیر نامہ

طہٰ مبین، کراچی

☆شیر عام طور سے 10 یا 15 شیروں کے گروہوں میں رہتے ہیں۔

☆ایک بالغ نر شیر کی گرج دار آواز 8 کلومیٹر دور تک سنی جاسکتی ہے۔

☆ایک شیرنی کو دن میں 5 کلو گوشت کی ضرورت ہوتی ہے اور نر شیر روزانہ 7 کلو یا زیادہ گوشت کھاتا ہے۔

☆مادہ شیرنیاں مل جل کر یا غول کی شکل میں شکار کرتی ہیں جب کہ نر شیر اپنے علاقے اور شیرنیوں کے غول کی نگرانی کرتے ہیں۔

☆کھلے جنگل میں شیر کی اوسط عمر 12 سے 16 سال تک ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسے چڑیا گھروں کے پنجروں میں بند رکھا جائے تو یہ 25 سال تک جی سکتا ہے۔

☆عام طور سے شیر اپنی خوراک کے لیے شام کے جھٹ پٹے سے لے کر سورج نکلنے تک شکار کرتے ہیں۔

☆شیر کے دوڑنے کی رفتار 81 کلومیٹر فی گھنٹہ تک ہوتی ہے۔

☆شیر اپنے سے سائز میں کہیں بڑے جانوروں کا شکار آسانی سے کرلیتا ہے جیسے زیبرا اور دوسرے جنگلی جانور وغیرہ۔

☆شیر عام طور سے دن کے 20 گھنٹے آرام کرتے ہوئے گزارتے ہیں۔n

شیخ چلی کو دولت کیسے ملی؟

اقراء کنول۔ اسلام آباد

شیخ چلی بچپن سے ہی بہت کام چور تھے۔ان کی ماں انہیں ہمیشہ سمجھاتی رہتی تھیں کہ بیٹا، کام چوری چھوڑو اور محنت کرو، تاکہ گھر میں دو پیسے آجائیں جس سے گھر بھی چلے اور تمہیں بھی محنت کی عادت پڑ جائے۔ لیکن میاں شیخ چلی ایک کان سے سنتے اور دوسرے کان سے اڑا دیتے۔

ایک روز شیخ چلی دن بھر گلیوں میں آوارہ گردی کرنے کے بعد جب گھر واپس آئے تو بہت تھکے ہوئے تھے، چناں چہ وہ لمبی تان کر سو گئے۔ سوتے میں انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ وہ ایک پہاڑی پر کہیں جا رہے ہیں، راستے میں انہیں ایک بوتل دکھائی دیتی ہے جس میں کوئی عجیب سی چیز ہے۔ نہ جانے یہ کیسا خواب تھا کہ گھبرا کر ان کی آنکھ کھل گئی اور شیخ چلی سوچے سمجھے بغیر اسی پہاڑی کی جانب چل پڑے جو انہیں خواب میں دکھائی دی تھی۔ سارا دن وہ اس پہاڑی پر مارے مارے پھرتے رہے، لیکن نہ کوئی بوتل دکھائی دی اور نہ عجیب چیز! تھک ہار کر انہوں نے گھر واپس آنے کا ارادہ کیا تو اچانک ایک پتھر ان کے پیر سے ٹکرایا۔اس پتھر کے پیچھے انہیں وہ بوتل نظر آئی جو انہوں نے خواب میں دیکھی تھی۔ ان کا دل چاہا کہ بوتل کا ڈھکن کھول دیں لیکن ڈر گئے۔ آخر ہمت کر کے انہوں نے بوتل کا ڈھکن کھول دیا۔ڈھکن کھلتے ہی بوتل میں سے دھواں باہر نکلا جو کچھ دیر میں ختم ہو گیا۔اب وہاں ایک خوب صورت نوجوان کھڑا تھا جسے دیکھ کر وہ ڈرے تو نوجوان نے کہا: ”مجھ سے مت ڈرو، میں یمن کا شہزادہ ہوں۔ایک جادوگر نے مجھے اس بوتل میں قید کر دیا تھا۔ تم نے مجھے اس بوتل سے آزادی دلائی ہے، میں تمہیں انعام ضرور دوں گا۔ بس تم مجھے میرے ملک یمن پہنچا دو۔“

شیخ چلی نے ایسا ہی کیا۔ یمن پہنچتے ہی شہزادے نے اپنا وعدہ پورا کیا اور شیخ چلی کو بہت سے ہیرے جواہرات اور ایک محل انعام میں دیا۔ شیخ چلی اپنی ماں کو بھی وہاں لے گئے جہاں دونوں ماں بیٹے ہنسی خوشی رہنے لگے۔ n

شہزادی کا تحفہ

ایس جی۔ پشاور

کسی ملک پر ایک رحم دل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔اس کی رعایا بھی اس سے بہت خوش تھی۔بادشاہ کی ایک بیٹی سنبل شہزادی بہت ذہین اور خوب صورت تھی۔بادشاہ بیمار ہوا تو سنبل شہزادی امور حکومت چلانے لگی۔یہ بات بادشاہ کے وزیر کو اچھی نہ لگی۔کچھ عرصے بعد بادشاہ کا انتقال ہو گیا تو چالاک وزیر نے شہزادی سنبل کو قید کر دیا اور یہ خبر اڑا دی کہ شہزادی بیمار ہے۔پھر وہ خود شاہی تخت پر بیٹھ گیا جس کے بعد کچھ ہی عرصے میں ملک کا نظام درہم برہم ہو گیا۔

اس ملک کے آخری حصے میں ایک بہت اونچا پہاڑ تھا جہاں سے دریا بہتا تھا جس کا پانی پورے ملک کے لوگ استعمال کرتے تھے۔اس پہاڑ پر ایک دیو نے قبضہ کر لیا اور ایک بہت بھاری پتھر رکھ کر پانی کا بہاؤ روک دیا جس سے ملک کو پانی ملنا بند ہو گیا۔

اب سب لوگ وزیر کے پاس پہنچے اور ساری بات بتائی تو وزیر بھی پریشان ہو گیا۔اس نے اپنے مشیروں کو صورت حال کا جائزہ لینے اس پہاڑ کی طرف بھیجا تو دیو نے انہیں مار مار کر زخمی کر دیا۔زخمی لوگوں کو دیکھ کر وزیر کے ہوش اڑ گئے۔پھر اس کے کچھ ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ یہ مسئلہ شہزادی کو بتایا جائے،وہ ضرور کوئی حل نکال لے گی۔وزیر نے کچھ سوچا، پھر شہزادی کو رہا کر دیا۔شہزادی باہر نکلی تو لوگوں نے اسے پانی کے مسئلے سے آگاہ کیا۔شہزادی کو بہت دکھ ہوا کہ وزیر نے ملک کا کیا حال کر دیا۔اگلی صبح شہزادی پہاڑ کی طرف روانہ ہو گئی۔

شہزادی کے ساتھ بہت سے لوگ چل پڑے۔کسی نے لاٹھی اٹھائی، کسی نے پتھر، کسی نے ڈنڈے اٹھائے۔وہ سب شہزادی کے ساتھ اس پہاڑ پر پہنچے۔سنبل شہزادی گھوڑے سے اتری اور پہاڑ کے اوپر پہنچی۔دیو نے شہزادی کو دیکھا تو ادب سے سر جھکا دیا۔شہزادی دیو سے بولی:"میں اس ملک کی شہزادی ہوں جس کا تم نے پانی بند کر رکھا ہے۔ہمارا پانی کھول دو، میں تمہارے لیے ایک تحفہ لائی ہوں۔"

یہ سن کر دیو نے ادب سے کہا:"پیاری شہزادی! آپ کیا لائی ہیں میرے لیے؟"

شہزادی نے ایک خوب صورت تاج دیو کی طرف بڑھایا جسے دیکھ کر دیو خوش ہو گیا۔سنبل شہزادی نے وہ تاج دیو کے حوالے کر دیا اور دیو نے آگے بڑھ کر وہ بھاری پتھر ہٹا دیا، پتھر ہٹتے ہی پانی ایک بار پھر پورے زور و شور سے بہنے لگا۔یہ دیکھ کر نیچے کھڑے لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے۔سنبل شہزادی دیو کا شکریہ ادا کر کے نیچے اتری اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر محل کی طرف بڑھی، ساتھ لوگ بھی چلنے لگے۔وہ شہزادی زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔جیسے ہی وہ لوگ محل کے قریب پہنچے تو محل کی کھڑکی سے چالاک وزیر نے یہ منظر دیکھا تو وہ ڈر گیا۔وہ محل کے پچھلے دروازے سے بھاگ کھڑا ہوا۔شہزادی سنبل نے ایک بار پھر اپنے باپ کا تخت و تاج سنبھال لیا اور اس ملک کے لوگ پہلے کی طرح ہنسی خوشی رہنے لگے۔n

سونے کا سکہ

کسی گاؤں میں کرم دین نام کا ایک نوجوان رہا کرتا تھا۔ اسے پیار سے سب کرمو کہا کرتے تھے۔ کرمو محنتی اور خوش اخلاق تھا۔ وہ اپنے دو بھائیوں اور بوڑھے والدین کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ کرمو اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، لیکن پھر بھی وہ دونوں بھائیوں سے زیادہ اپنے والدین کی خدمت کرتا تھا۔ وہ دن بھر محنت مزدوری کرتا اور رات کو والدین کی خدمت کرتا، ان کے پاؤں دباتا جس پر خوش ہو کر اس کے والدین اسے ڈھیروں دعائیں دیتے تھے۔

والدین بوڑھے ہو گئے تو کرمو کے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیوں نہ اس گھر کو اب کی زندگی میں ہی تقسیم کر لیا جائے، تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو۔ کرمو نے اپنے بھائیوں سے کہا: ”تم دونوں اس گھر کو تقسیم کر لو، مگر میں اپنے والدین کی خدمت کروں گا۔“

یہ سن کر دونوں بھائی خوش ہو گئے۔ اب کرمو سارا دن محنت مزدوری کرتا، پھر گھر آ کر اپنے والدین کی خدمت کرتا۔ اسی دوران اس کے والدین انتقال کر گئے۔

ایک مرتبہ کرمو نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص اس سے کہہ رہا ہے: ”اے کرم دین! تم نے اپنے والدین کا ادب کیا، ان کو راضی و خوش رکھا، اس کے بدلے تمہیں انعام دیا جائے گا۔ جاؤ فلاں چٹان کے نیچے سونے کا ایک سکہ پڑا ہے، وہ لے لو، وہ تمہارا انعام ہے۔“

کرمو صبح بیدار ہوا تو اس نے مطلوبہ جگہ جا کر دیکھا تو وہاں اسے سونے کا سکہ ملا۔ اس نے وہ سکہ اٹھا لیا اور خوشی خوشی گھر چلا آیا۔ n

سو گانٹھوں والا بانس

مرزا ظفر بیگ

ویت نام کے ایک گاؤں میں ایک دولت مند اور چالاک زمیں دار رہتا تھا۔اس کے پاس بہت سے ملازم تھے جنہیں وہ بہت پریشان کرتا تھا۔اس کی ایک خوب صورت بیٹی تھی جو شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔زمیں دار کے ہاں کھوئی نام کا ایک محنتی اور شریف ملازم تھا جو بچپن سے وہیں رہتا تھا۔اب وہ بھی جوان ہو چکا تھا۔زمیں دار جانتا تھا کہ جلد کھوئی اس کے گھر سے چلا جائے گا، مگر وہ اتنے اچھے ملازم سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

ایک روز زمیں دار نے کھوئی سے کہا:"اگر تم مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے تو میں اپنی بیٹی سے تمہاری شادی کر دوں گا۔"

کھوئی یہ سن کر بہت خوش ہوا اور پہلے سے بھی زیادہ محنت سے کام کرنے لگا۔ تین سال گزر گئے۔اب زمیں دار کی بیٹی اور بھی حسین ہو گئی تھی۔اس کی شہرت ہر طرف پھیلی تو پڑوس کے گاؤں کا دولت مند مکھیا،زمیں دار کی بیٹی کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر پہنچا۔ زمیں دار نے فوراً یہ رشتہ منظور کر لیا اور دونوں گھرانوں نے شادی کی تیاری شروع کر دی۔

جب یہ بات کھوئی نے سنی تو اس نے زمیں دار سے احتجاج کیا۔زمیں دار کو غصہ تو بہت آیا، مگر اس نے مکاری سے کام لیتے ہوئے کہا:"میری بیٹی کی شادی تم سے ہی ہو گی۔اس دوران تم میرا ایک کام کر دو۔مجھے کہیں سے ایسا بانس لا دو جس میں سو گانٹھیں ہوں۔پھر تمہیں اس بانس کے سو ٹکڑے بھی کرنے ہوں گے۔یہ سب اہتمام تمہاری شادی کے لیے ہی تو کیا جا رہا ہے۔"اب کھوئی سو گانٹھوں والے بانس کی تلاش میں نکل گیا۔اس نے پورا جنگل چھان مارا، مگر کچھ نہ ملا۔وہ مایوس ہو کر ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگا۔ یکایک سفید بالوں والا ایک فقیر اچانک وہاں نمودار ہو گیا۔اس نے کھوئی سے رونے کی وجہ پوچھی تو کھوئی نے اسے پورا قصہ سنا دیا۔

"تم ایسا کرو کہ جنگل سے ایک بانس لے کر اس کے سو ٹکڑے کاٹو اور میرے پاس لے آؤ۔"

کھوئی نے ایسا ہی کیا۔بوڑھے فقیر نے ان ٹکڑوں کو سامنے رکھ کر حکم دیا:"آپس میں جڑ جاؤ، آپس میں جڑ جاؤ!"

وہ تمام ٹکڑے اڑ اڑ کر آپس میں جڑ گئے اور سو گانٹھوں والا بانس تیار ہو گیا۔یہ دیکھ کر کھوئی بہت خوش ہوا۔اس نے بوڑھے فقیر کا شکریہ ادا کرنا چاہا، مگر وہ تو غائب ہو چکا تھا۔کھوئی نے بانس اٹھا کر گھر کی طرف چلنے کی کوشش کی تو اس سے اٹھ نہیں سکا، کیوں کہ وہ بہت بھاری ہو چکا تھا۔مایوس ہو کر کھوئی پھر رونے لگا تو سفید بالوں والا بوڑھا دوبارہ نمودار ہو گیا۔کھوئی نے اس سے مدد کی درخواست کی تو بوڑھے فقیر نے بانس کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا: "کھل جاؤ، کھل جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی بانس پہلے کی طرح سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور بوڑھا فقیر غائب ہو گیا۔

کھوئی ان ٹکڑوں کو لاد کر گھر پہنچا تو وہاں جشن کا سماں تھا۔

دولہا کی بارات آ چکی تھی۔کھوئی نے مہمانوں میں زمیں دار کو تلاش کر کے اس سے شکوہ کیا تو زمیں دار نے کہا: "میں نے تم سے سو گانٹھوں والا بانس منگایا تھا اور تم سو ٹکڑے اٹھا لائے؟"

اب تو سب مہمان ہنسنے لگے۔وہ سب مل کر کھوئی کا مذاق اڑا رہے تھے جس پر کھوئی کو بہت دکھ ہو رہا تھا۔

کھوئی نے زمیں دار سے کہا:"میں نے تمہاری شرط پوری کر دی ہے۔"یہ کہہ کر اس نے ہلکی سے آواز میں کہا: "آپس میں جڑ جاؤ، آپس میں جڑ جاؤ!"

تمام ٹکڑے فوراً جڑ گئے اور سو گانٹھوں والا بانس تیار ہو گیا۔اتفاق سے زمیں دار بانس کے قریب کھڑا تھا، اس لیے وہ بھی بانس کے ساتھ جڑ گیا۔ زمیں دار نے خود کو الگ کرنے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام رہا۔دولہا کا باپ اسے چھڑانے کے لیے آگے بڑھا تو کھوئی نے دوبارہ کہا:"آپس میں جڑ جاؤ، آپس میں جڑ جاؤ!"

اور وہ بھی زمیں دار سے جڑ گیا۔ یہی حال دولہا کا بھی ہوا۔انہوں نے لاکھ زور مارا، مگر خود کو ایک دوسرے سے الگ نہ کر سکے۔

اب تو سب پریشان ہو گئے۔انہوں نے کھوئی سے مل کر درخواست کی:"ہمیں معاف کر دو،ان لوگوں کو الگ الگ کر دو۔ہم سے غلطی ہو گئی ہے، آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔"

زمیں دار نے کھوئی سے کہا:"میں اپنے وعدے کے مطابق اپنی بیٹی کی شادی تم سے کرنے کو تیار ہوں، مگر مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دو۔"

دولہا اور اس کے باپ بھی اس شادی کے لیے تیار تھے۔ کھوئی نے کچھ سوچا اور مدھم لہجے میں بڑبڑایا:"کھل جاؤ، کھل جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی وہ سب آزاد ہو گئے۔دولہا اور اس کا باپ وہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگ گئے۔ان کے باراتی بھی ان کے پیچھے پیچھے تھے۔اس کے بعد کھوئی بڑی شان سے دولہا کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔اس کے برابر والی کرسی پر زمیں دار کی بیٹی بیٹھی مسکرا رہی تھی۔n

سچی خوشی

نرگس عامر۔ کورنگی کراچی

ایک دن میں اسکول سے گھر پہنچی تو دیکھا کہ ایک دس گیارہ سال کی بچی صحن میں جھاڑو لگا رہی ہے۔ میں اسے نہیں جانتی تھی۔ میں نے امی سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: ”برابر والی نذیرن خالہ کی بہن جو دوسرے محلے میں رہتی ہیں، وہ اس بچی کو نذیرن خالہ کے پاس لائی تھیں کہ اسے کسی گھر میں کام دلوادیں۔ وہ اسے میرے پاس لے آئیں۔“

”اور آپ کو اس بچی پر ترس آگیا ہوگا، اس لیے فوراً اسے کام پر رکھ لیا۔ ہے نا؟“ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! اس کے ماں باپ بہت غریب ہیں۔ ان کے آٹھ بچے ہیں اور یہ بچی فاطمہ ان کی سب سے بڑی بیٹی ہے۔ نذیرن خالہ کی بہن ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”لیکن امی! اس کے ماں باپ کو چاہیے تھا کہ اسے پڑھاتے، اس عمر میں اس سے ملازمت کروا رہے ہیں؟“ میں نے غصے سے کہا۔

امی فوراً بولیں: ”بیٹا! فاطمہ کے گھر میں لڑکیوں کا پڑھنا لکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا، اس کی ماں نے بھی کم عمری سے یہی کام کیا ہے اور ویسے بھی یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔“

امی ہمیشہ بہت نرم لہجے میں بات کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں اس سے دوستی کرلوں، کیوں کہ اب یہ ہمارے گھر میں ہی رہے گی اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹائے گی۔ امی نے یہ بھی بتایا کہ اسے یہاں سے جو پیسے ملیں گے، وہ نذیرن خالہ اس کے ماں باپ تک پہنچادیں گی۔

میں سوچ رہی تھی کہ امی سے میں نے ہی ملازمہ رکھنے کو کہا تھا، مگر وہ بہت چھوٹی تھی، گھر کے سارے کام کیسے کرسکتی تھی؟ میرا خیال ٹھیک ہی تھا، میں اسے جو کام بھی کرنے کو کہتی، وہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ کردیتی۔ میں اسے پیں پودوں کو پانی دینے کا کہتی تو سارا صحن ہی گیلا کردیتی۔ کبھی ڈسٹنگ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کوئی شو گر کر ٹوٹ جاتا۔ آٹا گوندھنے کو کہا تو اس پتنگ بنانے کی لئی بنادی۔ برتن بھی ٹھیک طرح سے نہ دھوتی تھی۔ پہلی بار جب برتن دھونے کو کہا تو وہ رونے لگی، وجہ پوچھی تو بولی: ”گھر والے یاد آرہے ہیں۔“

وہ جب بھی کوئی کام بگاڑتی مجھ سے ڈانٹ ضرور سنتی تھی۔ ایک روز میں ٹی وی دیکھ رہی تھی تو وہ بھی فرش پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے کہا: ”تم یہاں کام کرنے آئی ہو یا ٹی وی دیکھنے؟ جاؤ میرے کمرے کی صفائی کرو۔“

میری بات سن کر فاطمہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے کمرے میں گئی تو وہ میری کرسی پر بیٹھی میری کتابوں کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے پڑھنے کا شوق ہے۔

”میں نے تمہیں یہاں صفائی کے لیے بھیجا تھا نا؟“ میں نے پوچھا تو وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور جلدی جلدی صفائی کرنے لگی۔ میں نے امی سے اس کی شکایت کی تو امی نے مجھے سمجھایا: ”فاطمہ ابھی چھوٹی ہے، اسے مت ڈانٹا کرو، بلکہ پیار سے سمجھاؤ۔“

ابو بھی مجھے ایسی ہی نصیحتیں کرتے، مگر میں کیا کرتی، وہ جب بھی کوئی کام خراب کرتی تو مجھے غصہ آجاتا تھا۔

امی اب کھانا تیار کرتیں تو فاطمہ سے چھوٹے موٹے کام کروالیتی تھیں اور اس کے ساتھ بہت پیار سے پیش آتی تھیں۔ ہماری کلاس ٹیچر مس سارہ مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے ہمیں بہت اچھی اچھی باتیں بتائیں تو مجھے بہت اچھا لگا۔

مس سارہ نے بتایا تھا: ”جس طرح آپ سب روز تیار ہو کر اسکول آتے اور تعلیم حاصل کرتے ہیں، یہ دوسرے بچوں کو نصیب نہیں ہوگا۔ ہمارے ملک کے بے شمار بچے تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہیں۔ ان کے غریب والدین انہیں کم عمری سے ہی کام پر لگادیتے ہیں۔ وہ بچے مزدور بن کر غربت کی چکی میں پستے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے بے شمار بچے ہیں جو ہمیں سڑکوں پر اخبار اور پھول بیچتے یا گاڑیاں صاف کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی ایسا بچہ ہے تو اس کی مدد کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ پیار اور شفقت سے پیش آئیں اور اپنے اسکول کی کتابیں اسے بھی پڑھائیں۔“

مس سارہ کی باتیں سن کر مجھے فاطمہ کا خیال آیا اور اپنے رویے پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ گھر پہنچتے ہی میں نے اپنی الماری سے اپنے کچھ کپڑے نکالے اور امی سے کہا: ”آپ ان سے فاطمہ کے کپڑے بنادیں۔“

دوسرے دن میں امی کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تو ایک کے بجائے دو سوٹ خریدے: ایک اپنا اور دوسرا فاطمہ کا۔ کچھ کھلونے اور کتابیں بھی خریدیں۔ امی بھی اس تبدیلی پر حیران تھیں۔ انہوں نے مجھے خوش ہو کر شاباشی بھی دی۔

گھر آکر میں نے وہ ساری چیزیں فاطمہ کو دیں تو وہ بھی حیران رہ گئی۔ اس دن کے بعد سے میں نے فاطمہ سے دوستی کرلی۔ اب ہم دونوں مل جل کر رہتے ہیں۔ میں فاطمہ کے ساتھ کھیلتی بھی ہوں اور اسے پڑھاتی بھی ہوں۔ ابو جو بھی چیز لاتے ہیں، وہ ہم دونوں کے لیے ہوتی ہے۔ پہلے فاطمہ بہت بجھی بجھی رہتی تھی، لیکن اب میں نے اس کے چہرے پر ایک نئی چمک اور رونق دیکھی ہے۔ اسے خوش دیکھ کر میں بھی بہت خوش ہوں۔ اب مجھے احساس ہوچکا ہے کہ سچی خوشی کیا ہوتی ہے۔ n

ثریا بدل گئی

فیضان احسن۔ ضلع اٹک

ثریا نامی ایک شرارتی لڑکی ویسے تو نہ جانے کتنے کاموں میں بہت ماہر تھی لیکن دوسروں کو پریشان کرنے میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔انہیں پریشان کرنے میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔بات ان دنوں کی ہے جب سردیاں عروج پر تھیں۔مالٹے پک کر تیار ہو چکے تھے۔اس کے محلے میں بھی مالٹے کا باغ تھا۔وہ اپنے بھائی عثمان اور چھوٹی بہن نادیہ کو لے کر اس باغ میں گئی۔ابھی وہ تینوں وہاں پہنچے ہی تھے کہ مالی کا کتا بھونکتا ہوا ان کی طرف لپکا۔کتے کی آواز سن کر مالک کی آنکھ کھل گئی اور اس نے ان تینوں کو پکڑ لیا۔پہلے تو اس نے انہیں بہت ڈانٹا،پھر ان کے گھر جا کر شکایت بھی کی۔مالی کے جانے کے بعد ان کے امی ابو نے تینوں کو بہت ڈانٹا اور آخری بار ثریا کو وارننگ دی کہ وہ باز آجائے ورنہ سخت سزا ملے گی۔ لیکن ثریا پر کسی ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔وہ تو اپنے ماں باپ کی باتیں ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے اڑا دیتی تھی۔

ایک دن ان کے گھر مہمان آئے۔انہیں دیکھتے ہی ثریا کو شرارت سوجھی۔اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی طرح انہیں پریشان کیا جائے۔

اتنے میں اس کی امی کی آواز آئی:"ادھر آؤ ثریا اور چائے بناؤ۔"

ثریا نے ناگواری سے چائے تو بنالی، مگر پھر اس میں چینی کے بجائے نمک ڈال دیا۔ مہمانوں نے جب چائے پی تو ان کے منہ بن گئے۔ثریا نے اسی پر اکتفا نہ کیا،بلکہ ربر کا ایک سانپ ان کے پیروں میں رکھ دیا تو مہمان چیخیں مارتے ہوئے بھاگ گئے۔امی ابو نے یہ سب دیکھ لیا اور ثریا کو ڈانٹا تو وہ سر جھکا کر کسی معصوم بچی کی طرح کھڑی ہو گئی جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔

ایک دو روز کے بعد ثریا کے گھر پر دستک ہوئی۔ثریا نے دروازہ کھولا تو چند پولیس والوں کو کھڑے دیکھا۔انہوں نے ثریا کے ابو کو باہر بلایا اور اپنے ساتھ تھانے لے جانے لگے تو ثریا بھی پریشان ہو گئی۔پولیس والوں کا کہنا تھا کہ آپ کے موبائل سے ہر وقت 15 پر فون ملا کر تنگ کیا جاتا ہے۔ثریا کے ابو یہ سن کر حیران رہ گئے۔ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا جواب دیں۔

اچانک ثریا آگے بڑھی اور اس نے پولیس والوں سے کہا:"انکل!یہ ساری شرارت میری تھی،میں ہی آپ لوگوں کو ستاتی تھی۔اس میں میرے ابو کی کوئی غلطی نہیں ہے۔"

"تو ٹھیک ہے،تم وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرو گی۔"انسپکٹر نے کہا۔ثریا نے فوراً وعدہ کر لیا اور ہمیشہ کے لیے شرارتوں سے توبہ کر لی۔اب سب لوگ ثریا کی تعریف کرتے ہیں،کیوں کہ اس واقعے کے بعد وہ بہت اچھی بچی بن گئی ہے۔n

تبدیلی کا عمل

محمد وسیم کھوکھر۔ ہیڈ مرالہ

فہیم جب اسکول سے لوٹا تو اس کی امی نماز پڑھ کر اٹھ رہی تھیں۔اس نے انہیں سلام کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ امی یہ دیکھ کر حیران ہوئیں،کیوں کہ اس سے پہلے فہیم جب بھی اسکول سے لوٹتا تو آتے ہی گھر سر پہ اٹھا لیتا تھا،مگر آج وہ خلاف توقع سلام کر کے کمرے میں گیا تھا۔

انھوں نے کھانا گرم کیا اور اس کے کمرے میں گئیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ فہیم اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔وہ خاموشی سے باہر نکل آئیں۔پھر انہیں پچھلے ہفتے کا واقعہ یاد آیا جب فہیم کے ابو نے اسے نماز پڑھنے کے لیے کہا تھا تو اس نے ناگواری سے کہا تھا:"عمر پڑی ہے نماز پڑھنے کے لیے۔"

امی نے اس روز اسے پورا دن چیک کیا۔عصر،مغرب اور پھر عشا کی نماز بھی فہیم نے گھر میں ہی پڑھی۔وہ مسلسل سوچ رہی تھیں کہ فہیم میں یہ تبدیلی کیسے آئی ہے،اس کے پیچھے کیا راز ہے؟کوشش کے باوجود وہ فہیم سے کچھ نہ پوچھ سکیں۔رات کے کھانے پر جب سب گھر والے جمع ہوئے تو فہیم کے چہرے پہ اطمینان تھا۔اس نے کھانے میں بھی کوئی نقص نہ نکالا،جب کہ پہلے وہ ہر کھانے میں کوئی نہ کوئی خرابی نکالتا تھا۔سونے سے پہلے جب وہ دودھ دینے اس کے کمرے میں گئیں تو وہ اسکول کا کام کر رہا تھا۔اس نے ان سے کچھ کہنا چاہا،مگر کہہ نہ سکا۔

اس کی امی کو کل والا واقعہ یاد آیا کہ جب انھوں نے اس سے کہا تھا کہ تم اسکول سے آکر سارا ٹائم ویڈیو گیمز یا کارٹون دیکھتے رہتے ہو،کبھی اسکول بیگ بھی کھول لیا کرو تو فہیم نے انتہائی بد تمیزی سے انھیں جواب دیا تھا:"کیا یہ کم ہے کہ میں سارا دن اس بیگ کو اسکول میں کھولے رکھتا ہوں۔"

صبح جب فجر کی اذان ہوئی تو امی نے اسے گھر سے نکل کر مسجد جاتے ہوئے دیکھا تو سمجھ گئیں کہ تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔وہ سب کچھ جان کر بھی انجان بنی رہیں۔وہ چاہتی تھیں کہ فہیم اس سلسلے میں خود ان سے بات کرے۔ اسکول سے چھٹی کے بعد فہیم گھر لوٹا تو ظہر کی نماز میں کافی وقت تھا۔امی نے اسے کھانا دیا تو فہیم کچھ کہتے کہتے رکا۔ وہ بھانپ گئیں کہ فہیم دل کی بات زبان پہ لانا چاہ رہا ہے۔انھوں نے اپنا ہاتھ شفقت سے اس کے سر پہ رکھتے ہوئے کہا:"کھانا کھالو،ظہر کی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔نماز کے بعد تفصیل سے بات کریں گے۔"

فہیم نماز پڑھ کر گھر لوٹا تو سیدھا اپنی امی کے پاس چلا آیا اور انھیں بتایا:"کل میں اسکول جانے کے لیے بس اسٹاپ پر کھڑا تھا،کیوں کہ لیٹ ہونے کی وجہ سے اسکول وین جا چکی تھی۔میں بس سے اپنے اسکول جا رہا تھا اور بس میں تلاوت قرآن کی کیسٹ لگی ہوئی تھی جس میں بار بار یہ آیت دہرائی جا رہی تھی کہ 'اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔'

کل اسکول میں بریک ٹائم تک یہ بات میرے ذہن میں گونجتی رہی،دباؤ مسلسل بڑھ رہا تھا کہ اسی دوران ایک گونج مجھے اپنے چاروں طرف سنائی دی،مگر نظر کوئی نہیں آیا۔اسی وقت مجھے اپنے عربی کے ٹیچر آتے دکھائی دیے تو میں نے اس سلسلے میں ان سے بات کی۔انھوں نے میری بات سن کر میری راہ نمائی کرتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ نے ہمیں لاتعداد نعمتوں سے نوازا ہے،مگر ہم اس کا شکر بجا نہیں لاتے،ایک سے ایک نعمت ہماری زندگیوں میں ہے، مگر ہم انھیں جھٹلاتے ہیں اور ہماری زندگیوں سے ہمارے رب کی نعمتیں ختم نہیں ہوتیں،ہاں ہماری زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے رب کی عطا کردہ ہر نعمت کا شکر ادا کریں جس کا سب سے بہتر طریقہ نماز ہے۔والدین بھی اللہ کی دی ہوئی ایک بڑی نعمت ہیں۔ان کا احترام ہم پر واجب ہے۔"یہ کہہ کر فہیم ایک لمحے کو رکا اور پھر بولا:"امی جان!جب سے میں نے آپ کا کہنا مان کر اپنے رب کے سامنے جھکنا شروع کیا ہے تو ایسے لگتا ہے کہ زندگی کی بہاریں لوٹ آئی ہیں۔"

بیٹے یہ بات سن کر ماں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔فہیم کی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلی ان کے لیے بڑے سکون کا باعث تھی۔n

تمہارا شکریہ دوست

کنزہ مریم

"بس عامر! اب میں آگے نہیں پڑھوں گا۔" سہیل نے عامر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں سہیل! تم آگے کیوں نہیں پڑھو گے؟" عامر نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"مڈل کر لیا ہے ناں، بس بہت ہے۔ ویسے بھی ابا جی کہہ رہے تھے کہ وہ اب میری پڑھائی کا خرچ نہیں اٹھا سکتے۔ میں کل سے استاد لوہار کی دکان پر جاؤں گا، ان سے لوہار کا کام سیکھوں گا اور پھر اپنی دکان کھول لوں گا۔" سہیل نے بیزاری سے جواب دیا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ تم کوئی ہنر سیکھ لو، لیکن تعلیم کی اہمیت بہر حال اپنی جگہ ہے۔ تعلیم رویوں میں، سوچ میں، کردار و اخلاق میں اچھی اور مثبت تبدیلی لاتی ہے اور انسان کو اچھا انداز فکر دیتی ہے۔ علم بہر حال اہمیت رکھتا ہے۔"

عامر نے کہا تو سہیل نے اسے غور سے دیکھا اور پھر بولا:

"کیا اہم ہے بھائی! جو لوگ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بن جاتے ہیں، ان کا تو معاملہ ٹھیک ہے کہ اگر کسی اسپتال میں نوکری نہیں ملی تو اپنا چھوٹا موٹا کلینک کھول کر روزی روٹی کما لیتے ہیں، مگر جنہوں نے سادہ سا بی اے یا ایف اے کر کے کوئی کمپیوٹر کورس وغیرہ بھی کر لیا، ایسے لوگ نوکری کے لیے ایڑیاں رگڑتے رہ جاتے ہیں۔ اب اپنے راحیل بھائی کو ہی دیکھ لو، انہوں نے ایم اے اردو اور بی ایڈ کیا ہے، مگر ٹیچر کی ملازمت کے لیے آج تک دھکے کھا رہے ہیں۔ اگر ان کے پاس پڑھائی کے علاوہ کوئی ہنر بھی ہوتا تو اس طرح پریشان نہ پھرتے۔"

سہیل نے اپنی بات مکمل کی تو عامر نے کہا:

"تمہاری یہ بات درست ہے کہ تعلیم کے ساتھ ہنر سیکھنا بھی ضروری ہے، اسی لیے تو مجھے بھی ابو کل شام کو استاد نذیر کے پاس چھوڑنے جا رہے ہیں تاکہ ان سے کچھ کاروباری اونچ نیچ اور داؤ پیچ سیکھ سکوں۔ اس طرح دن میں اسکول اور شام میں دکان چلے گی۔ اگر قسمت میں ملازمت ہوئی تو پڑھائی مکمل کرتے ہی مل جائے گی ورنہ یہ دکان والا ہنر تو ہو گا ہی نا میرے ہاتھ میں جس کی مدد سے اپنا کام شروع کر دوں گا۔"

"عامر! تمہاری باتیں بہت اچھی ہیں بشرطے کہ ان پر عمل کیا جائے۔ انشاءاللہ اب میں ہنر سیکھنے کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کروں گا۔ تم نے بروقت میری راہ نمائی کر دی ہے، تمہارا شکریہ دوست!" سہیل کا فیصلہ سنتے ہی عامر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ خوش تھا کہ آخر کار سہیل نے تعلیم کی اہمیت کو سمجھ لیا۔ پھر دونوں دوست خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ n

وہ بے چارہ

محمد عثمان عمر۔ سرگودھا

ایک کوے کو شدید گرمی میں پیاس لگی۔ اس نے ادھر ادھر پانی فراہم کرنے والی کمپنیوں سے رابطہ کیا، لیکن جواب میں یہ پیغام ملا: آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔

گھر سے دور ایک دوسرے شہر میں کوا منرل واٹر کی ایک بوتل خرید لایا، لیکن پینے سے پہلے جب اس نے بوتل کے لیبل کو دیکھا تو پتا چلا کہ اس کی تاریخ گزر چکی تھی۔ تھک ہار کر ایک فلٹر پلانٹ پر گیا تو بجلی بند کی وجہ سے پانی میسر نہیں تھا۔

اڑتا اڑتا قریب بہنے والی ندی پہ گیا تو وہاں آلودگی اور کوڑے کرکٹ کی وجہ سے اس کو پانی نظر ہی آیا۔

سوچنے لگا کہ ویسے بھی لوگوں کو اب مجھ سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ کسی کی منڈیر پر بولوں تو لوگ کہتے ہیں اب ”مہمان“ آئیں گے، کسی کے سر کے اوپر سے گزروں تو ”ٹھونگ“ کا ڈر ہوتا ہے۔ آخر لوگوں کو میرے رنگ اور آواز سے کیوں نفرت ہے؟

آخری آسرا لے کر ”دریائے راوی“ کی طرف روانہ ہوا تو جو لوگ سیر کرنے آئے ہوئے تھے، انھوں نے کوے کو پانی کی طرف جانے ہی نہیں دیا۔

آخری سہارے کے طور پر اوپر دیکھا تو آسمان میں کالے کالے بادل نظر آئے جس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے خوب بارش ہوئی۔ کوے نے پانی پیا، غسل کیا اور پھر مزے سے واپس اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ n

وہ ٹھیک سمجھا

عروشہ بنت عمر حیات۔ ڈجکوٹ

امجد آج وقت سے پہلے ہی اپنے کام پر آ گیا تھا۔ اسے شدت سے افضل کا انتظار تھا۔ امجد نے آج فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ افضل سے پوچھ کر رہے گا کہ وہ اتنی معمولی سی تنخواہ میں کیسے گزارہ کرتا ہے کہ ہر وقت خوش رہتا ہے۔

امجد اور افضل ایک ہی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ امجد، افضل سے بڑی اور اچھی پوسٹ پر کام کرتا تھا، جب کہ افضل ایک معمولی سا ورکر تھا، مگر پھر بھی امجد ہر وقت پریشان رہتا تھا اور زیادہ دولت کمانے کے لیے ناجائز ذرائع بھی استعمال کرتا تھا۔ حالاں کہ اس کے پاس بہت سی دولت جمع تھی، مگر پھر بھی وہ خوش نہیں رہ پاتا تھا، کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ دولت ہی انسان کو خوشیاں دیتی ہے۔ مگر دوسری طرف افضل اپنی معمولی سی تن خواہ پر بھی خوش تھا۔ امجد آج اس راز کو جاننا چاہتا تھا کہ افضل کس طرح خوشیوں بھری زندگی بسر کر رہا ہے۔

افضل اپنے وقت کے مطابق کام پر آیا اور امجد ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور اس سے اپنے ذہن میں ابھرنے والا سوال پوچھ ڈالا۔

افضل نے غور سے امجد کی بات سنی اور جواب دیا: ”بے شک، میری تن خواہ تھوڑی ہے، مگر مجھ میں زیادہ کی ہوس یا لالچ نہیں ہے۔ مجھے میرے رب نے جو عطا کیا ہے، میں اس پر اس کا شکر ادا کرتا ہوں، اس لیے خوش ہوں۔ مگر جب آپ خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے اس سے شکوے شکایتیں کرتے ہیں اور آگے بڑھنے کے لیے محنت کرنے کے بجائے ناجائز ذرائع سے کام لیتے ہیں تو بے چینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ اپنے اندر کا سکون کھو دیتے ہیں، کیوں کہ ناجائز طریقے سے دولت کمانے سے دولت تو بڑھ جاتی ہے، مگر ساتھ ہی آپ کا لالچ بھی بڑھ جاتا ہے اور جیسے جیسے آپ کی دولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے آپ کا لالچ بھی بڑھتا جاتا ہے جس کی وجہ سے آپ کو ایک پل کا بھی سکون نہیں ملتا، بلکہ آپ کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔“

ایک لمحے میں افضل کی پوری بات امجد کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے عہد کر لیا کہ وہ لالچ کرنے کے بجائے اپنے رب کا شکر ادا کرے گا اور ناجائز ذرائع استعمال کرنے کے بجائے محنت سے کام کر کے دولت حاصل کرے گا۔ n

یہ کیا ہے؟

عنبر بیگم

ایک جنگل میں بہت سے جنگلی جانور اور درندے مل جل کر رہتے تھے۔ایک روز ان سبھی نے جنگل میں ایک بہت ہی عجیب وغریب چیز دیکھی۔وہ چیز اصل میں کسی انسان کا جوتا تھا جو نہ جانے کیسے وہاں آ گیا تھا۔ہو سکتا ہے وہ جوتا کسی شکاری کا ہو، یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں سے گزرتے ہوئے کوئی مسافر آرام کرنے رکا ہو اور بعد میں اپنا جوتا پہننا بھول گیا ہو۔وجہ جو بھی تھی، وہ جوتا جنگل میں پڑا ہوا تھا۔چوں کہ جانوروں نے پہلے کبھی انسان کا جوتا نہیں دیکھا تھا،اس لیے ان سب میں تجسس پیدا ہو گیا اور وہ اس کے بارے میں اپنی اپنی رائے دینے لگے۔

بھالو نے کسی ماہر جاسوس کی طرح اس جوتے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا:"مجھے پورا یقین ہے کہ یہ کسی پھل کا خول ہے جس کے اندر کا گودا کھا لیا گیا ہے اور خول کو یہاں پھینک دیا گیا ہے۔"

دوسری طرف بندر بڑی ہوشیاری سے اس جوتے کے لمبے فیتوں کو دیکھ رہا تھا۔اس کا سر آہستہ آہستہ اس طرح ہل رہا تھا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔پھر اس نے جوتے کے لمبے فیتوں کی طرف اپنے پنجے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:"میں سمجھ گیا،ذرا غور کرو،یہ جڑیں نہیں تو اور کیا ہیں؟گویا یہ ایک پودا ہے۔"

اس دوران کسی نے بھیڑیے کی طرف نہیں دیکھا جو مسلسل اس جوتے کو دیکھے جا رہا تھا۔پھر اس نے اپنی غراہٹ بھری آواز میں کہا:"یہ کچھ اور نہیں،بلکہ ایک گھونسلا ہے۔اس کے اندر جو یہ کھوکھلا حصہ دکھائی دے رہا ہے،اسی میں وہ پرندہ انڈے دیتا ہو گا جس کا یہ گھونسلا ہے۔ہے ناں؟"

ایک بڑی چڑیا کافی دیر سے ایک قریبی درخت پر بیٹھی ان سب کی باتیں بھی سن رہی تھی اور ان کی بحث سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھی۔اس نے ہنستے ہوئے کہا:"تم سب غلط کہہ رہے ہو۔

نہ یہ پودا ہے نہ خول اور نہ ہی گھونسلا ہے۔ایک بار میں انسانوں کی بستی کی طرف گئی تھی جہاں صرف انسان ہی رہتے تھے۔وہاں میں نے یہ چیز دیکھی تھی۔وہ لوگ اسے جوتا کہہ کر پکار رہے تھے۔انسان اس چیز کو اپنے پیروں میں پہنتے ہیں۔"

"تمھاری ہمت کیسے ہوئی ہماری باتوں میں دخل دینے کی؟"جنگلی جانوروں نے خاصی ناگواری سے کہا:"یہ صرف جنگلی جانوروں کی محفل ہے اور اس میں صرف ہم جیسے ہی بول سکتے ہیں۔تم ایک اڑنے والی چڑیا ہو،تمھارا اس معاملے سے کوئی لینا دینا نہیں،اس لیے تم اپنی چونچ بند ہی رکھو،یہ ہمارا معاملہ ہے،ہم خود ہی فیصلہ کر لیں گے کہ یہ کیا چیز ہے۔"

بڑی چڑیا نے بڑے دکھ سے ان جانوروں کی طرف دیکھا اور کہا:"تم میری بات مانو یا نہ مانو،مگر سچ یہی ہے۔یاد رکھو! تم ہر چیز کے بارے میں نہیں جان سکتے اور جن چیزوں کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے،ان کے بارے میں دوسروں سے پوچھ لینا اچھا ہوتا ہے۔"یہ کہہ کر بڑی چڑیا وہاں سے اُڑ گئی۔n

یہ مہکتے پھول

سدرہ رحمٰن۔ سرگودھا

"واہ! ہماری بٹیا نے تو گھر کو جنت ہی بنا دیا۔" پھوپھو اندر داخل ہوئیں تو بلی کے چھوٹے سے باغیچے کو دیکھ کر بولے بغیر نہ رہ سکیں۔

"بس پھوپھو! آپ کی بٹیا کو اپنے شوق سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔" پودوں کو پانی دیتے ہوئے بلی مسکرا کر بولی: "موتیا کے پھول تو ابھی ہفتہ پہلے ہی لگائے ہیں اور یہ نیلا گلاب آج کھلا ہے، کتنا پیارا لگ رہا ہے! ہیں نا پھوپھو؟" بلی پر جوش ہو کر ایک ایک پھول اور بوٹا پھوپھو کو دکھا رہی تھی۔

"واقعی میری گڑیا کی محنت کی جھلک ایک ایک پتے سے نظر آ رہی ہے۔" پھوپھو نے بلی کے سر پہ ہاتھ پھیر کر داد دی۔

بلی ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ پھول جیسی لڑکی جتنی خود نازک تھی، اس سے زیادہ پھولوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کرتی تھی۔ اسکول میں بھی وہ کسی لڑکی کو پھول تو کیا، ایک پتا توڑنے سے بھی روکتی تھی۔ اس کے برعکس گھر میں چھوٹی بہن رانی جو بہت شرارتی تھی، اسے بہت تنگ کرتی تھی۔ بلی بہت احتیاط کرتی، مگر رانی آنکھ بچا کر ایک آدھ پھول ضرور توڑ لیتی اور بلی دیکھتی ہی رہ جاتی۔

"یہ گھاس مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ شام کو یہاں بیٹھ کر ہوم ورک کرتی ہوں تو بہت مزہ آتا ہے۔ صبح کو اس پر شبنم کے قطرے سورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے بہت خوب صورت لگتے ہیں۔" بلی پھوپھو کو بتاتے ہوئے پیچھے مڑی تو کیا دیکھا کہ رانی نیلا گلاب توڑ چکی تھی اور باہر بھاگ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر بلی کو غصہ آ گیا، اس نے چیختے ہوئے کہا: "کیوں توڑا ہے تم نے اس پھول کو؟" ساتھ ہی اس نے رانی کے ایک تھپڑ بھی مار دیا۔

رانی جلدی سے بولی: "مجھ سے ثانیہ نے کہا تھا کہ یہ پھول توڑ لاؤ، اس سے اپنے گھر کو سجائیں گے۔ آج ہماری گڑیا کی شادی ہے۔" رانی نے روتے ہوئے بتایا۔

"کہاں ہے ثانیہ؟ اسے یہاں پکڑ کر لاؤ۔" بلی نے کہا تو رانی ثانیہ کو بلا لائی اور بلی دونوں کو لے کر پھوپھو کے پاس لے گئی۔

"پھوپھو! اب آپ ہی انہیں سمجھائیں۔ میں تو تھک گئی ہوں اپنے پودوں کو ان سے بچا بچا کر۔ روز ایک آدھ پودے کا ستیاناس کر دیتی ہیں۔" بلی نے بے بسی سے پھوپھو سے کہا۔

"ادھر بیٹھو بیٹا!" پھوپھو نے بڑے پیار سے دونوں کو اپنے پاس بٹھایا اور سمجھانے لگیں: "دیکھو بیٹا! آپی کتنی محنت سے پودوں کو پانی دیتی ہیں، ان کی حفاظت کرتی ہیں اور آپ دونوں ان کو تنگ کرتی ہیں۔ یہ تو بری بات ہے۔ پھول تو نازک سے ہوتے ہیں۔ ان کو توڑنے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے جیسے ہمیں چوٹ لگنے سے ہوتی ہے۔ ہم تو رونے لگتے ہیں یا بول کر بتا سکتے ہیں کہ ہمیں درد ہو رہا ہے، مگر یہ تو بے زبان ہیں، بول بھی نہیں سکتے۔ ان کو تکلیف دینے سے ہمیں بھی گناہ ملتا ہے۔ یہ رنگ برنگے خوب صورت پھول تو ہماری زمین کا زیور ہیں۔ جیسے آپ لوگ عید پر رنگ برنگی چوڑیاں اور جیولری پہن کر پیاری لگتی ہیں، اسی طرح ہمارا گھر ان خوب صورت پھولوں اور ان کی خوش بو سے مہکتا اور پیارا لگتا ہے۔ اگر آپ ان کو توڑ کر پھینک دیں گی یہ تو مر جائیں گے، پھر ہمارا گھر پیارا تو نہیں لگے گا ناں؟" پھوپھو نے بڑے پیار سے دونوں کو سمجھایا تو انہوں نے بلی سے کہا: "آپی ہمیں معاف کر دیں۔ آئندہ ہم کبھی آپ کو تنگ نہیں کریں گے اور آپ کی ہر بات مانیں گے۔" پھر دونوں نے پھوپھو کی طرف گھوم کر کہا: "پھوپھو! ہم آپ سے بھی وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ نہ خود پھول توڑیں گے اور نہ دوسروں کو توڑنے دیں گے، بلکہ آپی کی طرح ہم بھی پھولوں کی حفاظت کریں گے۔"

ان کی باتیں سن کر بلی مسکرا دی۔ اس نے پھوپھو کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے ان دونوں بچیوں کو پھولوں کی اہمیت بتائی تھی۔n